www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کے مسائل اور اُن کا حل

مرتب: سمیرا احتشام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کے مسائل اور اُن کا حل

(والدین اور اساتذہ کے حوالے سے)

مرتب: سمیرا احتشام

رائل بک سنٹر
چوک نواب صاحب - گجرات

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور
E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : بچوں کے مسائل اور اُن کا حل

مرتب : سمیرا احتشام

پبلشرز : فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ، لاہور

فون: 7249218-7237430

اہتمام : ظہور احمد خاں

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : اکرم پرنٹرز، لاہور

سرورق : عباس

اشاعت : 2009ء

قیمت :

ہیڈ آفس 18-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور

124-ٹیمپل روڈ لاہور

فون: 042-7321040

سب آفس حیدرآباد

52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدرآباد

فون: 022-2780608

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انتساب

اپنے پیارے ابّی جان

پروفیسر سمیع اللہ قریشی

کے نام!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست

☆ پیش لفظ	سمیرا احتشام	7
1- ولادت سے پہلے	ڈاکٹر جمال الدین	11
2- پیدائش کے بعد، سکول سے پہلے	پروفیسر بیگم صفیہ جمیل	28
3- ماں باپ کی محبت	ڈاکٹر حمید الدین	42
4- بچے کے تلخ تجربات ـــ مدرسے میں	مس عزیز محمد حسین	55
5- بچوں کی رہنمائی میں اُستاد کا حصہ	پروفیسر ابراہیم شمیم	66
6- بگڑے والدین	شہزاد احمد	71
7- بگڑے بچے	مظفر احمد قریشی	77
8- بگڑے استاد	مس عشرت النساء	90
9- بچے کی علامتی اہمیت	ڈاکٹر محمد اجمل	98
10- بچوں کی رہنمائی کا کلینک	ڈاکٹر مس اقبال ڈار	102
11- میری امی	ڈاکٹر ستنام محمود	109
12- بچے کے فطری تقاضے	ڈاکٹر نسیم شوکت	113
13- والدین، سکول اور معاشرہ	پروفیسر صوفی گلزار احمد	119

www.iqbalkalmati.blogspot.com

-14	عنفوانِ شباب کے جھمیلے	پروفیسر سعید شیخ	134
-15	بچے کا ماحول اور والدین	اکرم طاہر	149
-16	یہ بچے تمام عمر دوسروں کے محتاج رہتے ہیں	پروفیسر صوفی گلزار احمد	153
-17	بچے کی مشکلات اور اُن کا حل	ڈاکٹر مس اقبال ڈار	156
-18	غلط افتادہ بچے	پروفیسر چوہدری عبدالقادر	163
-19	بچوں کے چند عام امراض	ڈاکٹر واسطی	170
-20	کھیل اور بچے کی تعلیم	منور جہاں رشید	178

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش لفظ

نسلِ انسانی کی متاع میں بچہ ہی وہ وجود ہے جسے آگے چل کر باپ یا ماں کے روپ میں ڈھلنا ہوتا ہے۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ اسے انسانی معاشرے میں کبھی نا اُمیدی کی علامت نہیں بلکہ ہمیشہ اُمید کا استعارہ جانا گیا ہے۔ اس کے وجود کو انسانی معاشرے میں کہیں بھی اور کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکا، اور یہی روّیہ اس کے قیمتی وجود کی اہمیت کا آئینہ دار ہے۔ دنیا کی مختلف اقوام کے دانش وروں نے اپنے اپنے انداز میں بچے کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے خود فخر محسوس کیا ہے۔ مشہور فرانسیسی ادیب روسو نے کیا خوب کہا تھا:

> ''بچے کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے دیکھنے، سوچنے اور احساس کرنے کا اپنا ہی طریقہ ہے جو بڑوں سے مختلف ہوتا ہے۔ قدرت کا مشاہدہ یہ ہے کہ بچے بڑے ہونے سے پہلے بچے ہی ہوں۔ اگر ہم اس ترتیب کو بدلنے کی کوشش کریں گے تو ہم گویا ایسے پھل ہی پیدا کریں گے جن میں نہ پختگی ہوگی نہ مزا۔ ایسے پھل کچے ہونے کے باوجود جلدی گل سڑ جائیں۔ ہماری پیداوار ننھے بزرگ اور بوڑھے بچے ہوں گے۔''

مشہور ادیب پطرس کا قول ہے کہ:

> ''بچوں کا ذہن وہ عجیب وغریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں اور بلیاں بل کھاتی ہیں اور ٹرٹر موٹر، چھم چھم، ٹم ٹم میں آنگن کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تاش کی کرامت سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے ہیں، گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہنِ انسانی، بیزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔"

فرانسس ٹامس نے بہت خوبصورت بات کہی ہے:

"بچے کی مسکراہٹیں پاکیزہ دن کو مقدس ترین بنادیتی ہیں۔ نغمۂ رُوں رُوں کی آواز لبوں کے تاروں سے کیوں نہ اُبھرا ہو اور تاروں بھری رات کی سنہری موجوں پر رقص کیوں نہ کریں۔ بچے کے رخساروں پر آکر مدھم پڑ جاتا ہے۔ بچے کی دنیا عام انسانوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے یہ دنیا حسین اور محبت کی بستی ہے۔ اس میں کوئی شے بدصورت نہیں۔ اس میں ہر چیز اس عالمِ موجودات سے الگ تھلگ وجود رکھتی ہے جسے بچہ خود تخلیق کرتا ہے کیونکہ اس کی روح میں ایک مقدس اخلاق کارفرما ہے جو ایک مکان کو پہاڑ، ایک پھول کو باغ میں منتقل کر دیتا ہے۔ بچہ ایک کوزہ ہے لیکن اس میں ایک سمندر کارفرما ہے۔ وہ ایک خفیف سا لفظ ہے لیکن خود کو ایک بے پایاں کائنات کا شہنشاہ سمجھتا ہے۔"

بچوں کے بارے میں پیغمبروں کے اقوال بھی موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

"ان بچوں کو میرے پاس آنے دو کیونکہ آسمانی بادشاہت انہی کی ہے۔"

ہمارے آقا محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بچوں سے بے حد پیار تھا۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا:

"ہر بچہ فطرتِ الٰہی پر پیدا ہوتا ہے ان کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔ بچیاں اللہ کی رحمت ہیں۔ ان کی صحیح تربیت کرنا اللہ کی رحمت طلب کرنا ہے۔ اپنے بچوں کو تعلیم دو اور انہیں مہذب بناؤ۔"

پیغمبروں اور دانش وروں کی ان آراء سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک صحت مند جمہوری معاشرے کی داغ بیل ڈالنے میں بچے یا اولاد اور جسے طالب علم بننا ہے اور والدین اور اساتذہ کا بہت ہاتھ ہے۔ یہ تکون بچوں کی درست نشوونما میں ایک ضمانت کا درجہ رکھتی ہے۔ جمہوری تعلیم کا ایک خاصہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ اس میں انتظامیہ اور اساتذہ کے درمیان ایسا رابطہ ہو جس کی بنیاد باہمی تعاون پر ہو تا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں آسانی سے حصولِ مقاصد کے لئے کوشش کر سکیں۔ اسی طرح طالب علم اور اساتذہ میں بھی محبت کا جذبہ ہونا ضروری ہے تا کہ طالب علم کو اپنی ضروریات اور تعلیمی مسائل اور مشکلات نہایت خوشگوار طریقے سے اساتذہ کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملے اور اساتذہ ان مشوروں کے ساتھ طالب علم پر اچھا اثر ڈال سکیں۔ تعلیم کا یہی تصور ہر جمہوری نظام کا سنگِ بنیاد ہوتا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ بچے کے بغیر گھر کا تصور بے معنی ہے۔ جس گھر سے بچے کے رونے کی آواز نہیں ابھرتی وہ گھر خالی مکان ہے۔ پل بھر میں رو دینے اور پلک جھپکتے ہی ہنس دینے والا یہ کھلونا اگر عورت کی گود میں نہیں ہے تو وہ عورت نامکمل ہے۔ بچہ جو دوسروں کو آپ سے پیار کرنا سکھاتا ہے۔ بانجھ عورت صرف اپنا دکھ جانتی ہے کسی بچے کا غم نہیں پہچانتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک مقام پر پہنچ کر اسے اپنی ذات اور اپنے خاوند سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ سارے خاندان میں پیار بانٹتا ہے، نئے نئے رشتے قائم کرتا ہے۔ ایک انسان کا تعلق بچے کے وجود سے دوسرے انسان سے گہرا ہو جاتا ہے اور ایک چھوٹے سے گھر میں دنیا کی ساری خوشیاں سمٹ آتی ہیں۔ جو بچہ والدین کی گود میں آ جاتا ہے اس کی حفاظت انہی کے ذمہ ہو جاتی ہے۔ بچہ بڑا ہو جائے اور اگر لوگ اس کی صورت دیکھ کر اس سے ڈر جائیں یا نفرت کریں تو قصور والدین کا ہوگا۔ بچہ موم کی طرح ہوتا ہے جس سانچے میں چاہیں اسے ڈھال لیں۔ اس موم کی مورتی کی ساری خوبصورتی والدین کے ہاتھوں کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا سارا حسن والدین کی تربیت اور پرورش پر ہوتا ہے۔ اس کے حسن کے قائم رہنے کا انحصار والدین کی نگہداشت پر ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کی طرح بچے کی پرورش بھی ایک فن ہے۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ ماں باپ نہیں سکھاتے وہ حالات سکھا دیتے ہیں۔ یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ قصاب کا بچہ ہاتھ میں چھری لئے زندگی بھر بکرے ذبح کر کے ان کا گوشت بیچتا رہے۔ وہ دکاندار کی بجائے خریدار بھی بن سکتا ہے۔ بڑھئی کے بچے پر یہ لازم نہیں کہ وہ عمر بھر کرسیاں بناتا رہے وہ کسی دفتر کی اونچی کرسی پر بیٹھ کر حکم بھی چلا سکتا ہے۔ والدین کا پیشہ بچے کو متاثر نہیں بھی کر سکتا۔ پرورش اور تربیت ہی اسے مستقبل کی راہ دکھاتی ہے۔ بچہ نہ بڑھئی ہوتا ہے نہ لوہار۔ وہ شرارتی ہو سکتا ہے، معصوم ہو سکتا ہے۔ اس کی صلاحیتوں سے آگاہ ہونا والدین کا فرض ہے۔ کسی چیز کو دیکھ کر رو دینے والا بچہ اور کسی کھلونے کو دیکھ کر مسکرا دینے والا بچہ ضرور اپنے بڑوں سے کچھ کہہ رہا ہوتا ہے۔ اس کا رونا اور ہنسنا بے مقصد نہیں ہوتا۔ دراصل وہ اس وقت نہایت معصومیت سے اپنے والدین کی ذہانت کا امتحان لے رہا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اپنے بڑوں کی مدد سے بچہ زندگی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ رہا ہوتا ہے۔ اگر اس وقت والدین سے بھول ہو جائے تو بہت ممکن ہے کہ سیڑھی کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ دھڑام سے نیچے آ گرے اور آپ اس کی وجہ بھی نہ جان سکیں۔

نقل اُتارنے میں بچے بہت تیز ہوتے ہیں۔ کوئی ان کے سامنے اپنی صورت بگاڑ کر دیکھے وہ بچے کوشش کر کے اس کی نقل اُتاریں گے۔ کسی بڑے کے منہ سے نکلا ہوا لفظ بچہ فوراً ادا کرے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہو پائے۔ اس ناکامی کا جواز ان کی ذہنی سطح ہوتی ہے۔ وہ لہجے کی نقل اتار سکتا ہے لہجہ اپنا نہیں سکتا۔ بعض بچے اس معاملے میں البتہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اب یہ والدین کا کام ہے کہ وہ ان کی حرکات پر نظر رکھیں۔

کچھ انہی خیالات کی ترویج اور بازیافت کے لئے لاہور سے شائع ہونے والے مشہور ہفت روزہ رسالہ ''لیل و نہار'' لاہور کی 4- نومبر 1962ء کی اشاعت مخصوص کی گئی تھی جسے مشہور شاعر اور بزرگ مرحوم صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم صاحب نے ترتیب دیا تھا۔ آج اس بات کو نصف صدی ہونے کو آتی ہے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ اس اشاعتِ خاص میں جو مضامین جمع کیے گئے ہیں ان کی ہمہ جہت اہمیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ ان مضامین کے لکھنے والے اپنے اپنے علمی میدان کے مشہور اور لائق قلم کار تھے۔ ان مضامین کی افادیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ ان قلم کاروں میں بہت سے بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ کچھ آج بھی اپنے علمی فرائض نبھانے میں بدستور منہمک ہیں۔ ان سب کے شکریے اور بے حد ادب کے ساتھ ان مضامین کو ترتیبِ نو کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس قوی اُمید کے ساتھ کہ والدین اور اساتذہ اپنے بچوں اور اپنے طلباء کے مسائل اور ان کے حل سے آگاہ ہو سکیں۔

سمیرا احتشام

ایم۔ ایس۔ سی اطلاقی نفسیات

اعلیٰ ڈپلومہ کلینکل نفسیات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ولادت سے پہلے

ڈاکٹر جمال الدین

آدم کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ خاک کا یہ پتلا فساد کا سرچشمہ ثابت ہوگا۔ اس کی تعمیر میں نہ جانے خرابی کی کون سی صورت مضمر تھی کہ فرشتوں کا کہا سولہ آنے سچ ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ انسان نے فساد کرنے کرانے میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ یہ اس کی طبعی خصوصیت بن گئی اور اس کے لئے اسے مزید کسی تربیت کی ضرورت نہ رہی۔

بعض حالات میں یہ خصوصیت اتنی شدت اختیار کر لیتی ہے کہ انسان کا بچہ اپنی پیدائش سے پہلے ہی فساد برپا کر دیتا ہے۔ چونکہ اس حالت میں اس کا زور دوسروں پر نہیں چلتا اس لئے وہ اپنی ماں پر ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیتا ہے۔ نتیجتاً بے شمار عورتیں خلقِ خدا میں اضافے کی کوشش کرتے ہوئے خود ہی خالق کے حضور پہنچ جاتی ہیں۔

حمل اور وضعِ حمل کے دوران عورتوں کی موت کے بے شمار اسباب ہیں۔ حمل کی ایک خطرناک بیماری کو ڈاکٹری میں (Eclampsia) اور ہماری زبان میں جن بھوت یا سایہ وغیرہ کہتے ہیں (جن بھوت کا تصور ہمارے ہاں صرف اسی ایک بیماری سے مخصوص نہیں اور بھی کئی بیماریاں انہیں 'صاحبوں' کا کرشمہ سمجھی جاتی ہیں) اس مرض کے علاوہ حمل کے دیگر امراض، سیلانِ خون، اسقاطِ حمل وغیرہ بھی کافی عورتوں کو زندگی کی ہر مصیبت سے نجات دلا دیتے ہیں۔ نیز وضعِ حمل کے وقت بھی عورتوں کی ایک کثیر تعداد اگلی دنیا کو سدھار جاتی ہے۔ پاکستان میں حمل کی ان بیماریوں سے مرنے والی عورتوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ حساب کتاب سے ہم ویسے بھی کچھ گھبراتے ہیں۔ بہتوں نے تو یہاں تک سوچ رکھا ہے کہ قیامت کے دن بھی حساب کتاب سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کنی کترانے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر لاکھ آدھ لاکھ عورتوں یا دو چار لاکھ بچوں کے مرنے سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ جو ہم خواہ مخواہ پریشان ہونا شروع کر دیں۔ عورتوں کی کیا کمی ہے۔ بیوی کی قبر کی مٹی سوکھنے سے پہلے ہی اللہ میاں دوسری عنایت کر دیتا ہے۔ بلکہ ذی استطاعت لوگوں کو تو بیوی کی موت کے انتظار کی زحمت برداشت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بیوی کی زندگی میں بھی ان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حمل اور اس کے امراض سے مرنے والی عورتوں کی تعداد ہمارے ملک میں بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے اور خدا کے کاموں میں دخل دینا نیک بندوں کا کام نہیں، پھر بھی جوان عورتوں کا اس طرح مر جانا مجھے قدرے شاق گزرتا ہے۔ اور چونکہ عشق آپ کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اور عشق و محبت کی راہیں ہمیشہ بچے کے گہوارے کی طرف جاتی ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جو دو چار سخت مقام راستے میں آتے ہیں ان سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے۔ اس لئے زمانہ حمل سے متعلقہ ہدایات اور اس کی مخصوص بیماریوں کا حال غیر فنی الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

اگرچہ عورتوں کی اکثریت کو اپنے حاملہ ہونے کا علم جلد ہی ہو جاتا ہے۔ تاہم ایسی نیک بخت بھی موجود ہیں جن کو اس عظیم واقعہ کا عرصہ دراز تک پتہ نہیں چلتا۔ برٹش میڈیکل جرنل میں ایک ایسی ہی باخبر اور خودشناس انگریزی بی بی کا کیس شائع ہوا تھا۔ جسے اپنے حاملہ ہونے (بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں حاملہ رہنے) کا علم بچہ پیدا ہونے کے بعد ہوا۔ حمل کی علامات، حیض کا بند ہو جانا، صبح کے وقت متلی اور قے، چھاتیوں کی نشوونما، پیشاب کا بار بار آنا، کھانے پینے کی عادات اور موڈ میں تبدیلی اور اٹھارہویں ہفتے کے بعد ماں کے پیٹ میں بچے کی حرکت ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی علامت بھی ایسی نہیں جس سے ابتدائی مراحل میں حمل کے ہونے یا نہ ہونے کا حتمی طور پر فیصلہ ہو سکے ان میں سے ابتدائی علامات حیض کا بند ہو جانا اور صبح کی متلی اور قے ہیں۔ مگر یہ حمل کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں۔ یہ مختلف امراض کی بنا پر حمل کے بغیر بھی ظاہر ہو سکتی ہیں اور حمل بھی ان کے بغیر قرار پا سکتا ہے۔ یہ علامات حمل کے بغیر، صرف حمل کی شدید خواہش یا حمل کے خوف کی وجہ سے بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان حالات میں حمل کے ہونے یا نہ ہونے کا سوال خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات لیڈی ڈاکٹر بھی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے بعض عورتوں کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایکسرے (X-Ray) کے ذریعے معائنہ کیا جاتا ہے۔ ایکسرے چودہ ہفتے کے بعد حمل کی تشخیص کر سکتی ہے مگران ابتدائی مہینوں میں ایکسرے بچے کے لئے بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس سے بچے کے اعضاء عجیب ہیئت اختیار کر سکتے ہیں یا دوسرے خلقی نقائص پیدا ہو سکتے ہیں۔ بچہ پیدائش سے پہلے یا بعد مر سکتا ہے یا لڑکپن میں مہلک امراض از قسم Leukaemia میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ایکسرے کے یہ نقصان دہ اثرات صرف حمل کے ابتدائی مہینوں میں ہوتے ہیں۔ حمل کے آخری دور میں ایکسرے کا استعمال نہ صرف نقصان سے خالی بلکہ بیشتر حالات میں ضروری بھی ہے۔ اس سے حتمی طور پر ماں کے پیٹ میں ایک سے زیادہ بچوں کے موجود ہونے کا پتہ چل سکتا ہے۔ بچے کے جسمانی نقائص دیکھے جا سکتے ہیں۔ بچے کے قد کاٹھ کا پتہ لگ جاتا ہے اور ماں کے استخوانی راستے کے ساتھ اس کی مناسبت یا عدم مناسبت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بچے کی پوزیشن صاف طور پر نظر آ جاتی ہے اور رحم میں اول Placenta کا مقام دیکھا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے حالات میں ایکسرے بچے اور ماں کی زندگی بچانے میں ممد ہوتی ہے کیونکہ ایکسرے کے بغیر درست علاج کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مطلب یہ کہ ایکسرے کو حمل کی پیچیدگیوں اور اس کے امراض کی تشخیص کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ خود حمل کی تشخیص کے لئے اس کا استعمال قطعاً غلط ہے۔ اس مقصد کے لئے پیشاب کا معائنہ کہیں بہتر طریقہ ہے۔

جب یہ یقین ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے تو اس کے فرائض کا دائرہ جو کہ پہلے ہی اتنا وسیع ہے کہ حساب دانوں کو بھی اس کا محیط کہیں نظر نہیں آتا، اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں تو عورت کا اوّلیں فرض یہ ہے کہ وہ جیسے بھی بن پڑے اپنے آپ کو اپنے خاوند کے لئے زندہ رکھے (کیونکہ عورت کے دماغ میں خود اپنے لئے زندہ رہنے کا تصور ابھی پیدا نہیں ہوا) لیکن حمل کی صورت میں بچے کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہو جاتی ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی زندہ رکھے اور بچے کو بھی۔ اس لئے لازم ہے کہ وہ اپنی صحت کو درست رکھے تا کہ اس کا بچہ صحت مند ہو۔ اس سلسلے میں جو ہدایات جدید طب نے مرتب کی ہیں وہ یا تو امریکہ میں قابلِ عمل ہیں یا یورپ میں۔ یہاں تو چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں والا معاملہ ہے۔ قومی آمدنی کے سلسلے میں شاید ہی کوئی ملک ہمارا مقابلہ کر سکے۔ ہمارے ہاں 30 فی صد لوگوں کی آمدنی فی کس دس روپے ماہوار سے کم ہے اور 40 فی صد کی 10 روپے سے 20 روپے ماہوار تک ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیشتر اس کے کہ میں انہیں سمجھاؤں کہ ان کی عورتوں کو زمانہء حمل میں کیا کھانا چاہیے، میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے سمجھائے کہ وہ کیا کھا کر زندہ ہیں، اور اب تک با جماعت مر کیوں نہیں گئے۔ کیوں کہ طبّی طور پر ان کے زندہ رہنے کی کوئی معقول وجہ مجھے تو نظر نہیں آتی۔ مگر صد آفرین ہے ان پر کہ اس بے سروسامانی میں بھی کس تندہی سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اضافے کا فرض مسلسل سرانجام دے رہے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کے سلسلے میں بھی شاید ہی کوئی ملک ہمارے ساتھ لگا رکھتا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کا خیال ہے کہ بچوں کو پالنا، کھلانا پلانا پہنانا، اِن کا علاج معالجہ کرنا اور انہیں تعلیم دینا والدین یا مجموعی طور پر قوم کا فرض ہے۔ مگر ہمارے ہاں واحد فرض کثیر تعداد میں کمزور اور بیمار بچوں کو صرف پیدا کر دینا ہے۔ کیونکہ ہم نے باقی تمام فرائض ایک مدت سے اللہ میاں کے سپرد کر رکھے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو خدا پیدا کرتا ہے وہ رزق بھی دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر رزق کے معاملے میں کمی ہو تو قصور (حاکم بدہن) اسی کا ہے ہمارا نہیں۔ بات پھر الجھ گئی۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ چونکہ ملک کی پچانوے فی صد آبادی غریب ہے۔ اس لئے ڈاکٹری ہدایات پر باقی ماندہ صرف پانچ فی صد لوگ ہی عمل کر سکتے ہیں۔

پہلی ہدایت یہ ہے کہ خوراک اچھی ہو۔ حمل کے زمانے میں عورت کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے (اور دودھ پلانے کے زمانے میں اس سے بھی زیادہ) حاملہ عورت کی خوراک کے اہم اجزا درج ذیل ہیں:

(1) اجزائے لحمیہ (Proteins) روزانہ 85 گرام ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ بچے کا جسم انہی سے بنتا ہے اگر عورت کی خوراک میں اجزائے لحمیہ کم ہوں تو بچہ اپنے جسم کی تعمیر کے لئے ماں کے جسم کو توڑ پھوڑ کر اجزائے لحمیہ حاصل کرتا ہے۔ جس سے عورت کمزور ہو جاتی ہے اور خوراک کی کمی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی کمزوری ہمارے ملک میں اسقاطِ حمل کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس طرح بے شمار عورتیں اللہ کو پیاری ہو جاتی ہیں۔ 85 گرام اجزائے لحمیہ کا کم از کم نصف حصہ ضرور اوّل درجے کا ہونا چاہیئے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسے حیوانات کے گوشت، دودھ، انڈے اور دودھ سے بنی ہوئی چیزوں سے حاصل کیا جائے۔ لہٰذا خوراک میں مندرجہ ذیل اشیاء ضروری ہیں:

دودھ 1/4 1 سیر روزانہ	اجزائے لحمیہ 32 گرام
گوشت آدھ پاؤ روزانہ	اجزائے لحمیہ 24 گرام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انڈہ ایک عدد	اجزائے لحمیہ	6 گرام
	میزان	62 گرام

بقایا اجزائے لحمیہ آلو مچھلی پنیر اور اناج سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

(2) کیلشیم (Calcium) یعنی چونا۔ بچے کی ہڈیاں اور دانت چونے سے تیار ہوتے ہیں حاملہ عورت کی روزانہ خوراک میں ڈیڑھ سے دو گرام تک چونا شامل ہونا چاہئے۔ بصورت دیگر بچہ ماں کی ہڈیوں سے چونا حاصل کر کے انہیں کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس سے رانوں کولہوں اور کمر میں درد، بے چینی اور بے خوابی کی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چلنے پھرنے سے تکلیف ہوتی ہے اور بعض اوقات چلنا پھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ نیز بچے کو چونا پوری مقدار میں میسر نہ آنے پر اس کی ہڈیاں کمزور رہتی ہیں۔ ایسے بچے بچپن میں ہڈیوں کی بیماری (Rickets) (جس کا حال آگے آئے گا) کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ اگر ماں کی خوراک میں چونا بہت کم ہو تو بچے میں پیدائش کے وقت ہی یہ بیماری موجود ہوتی ہے (ہماری قوم اس بیماری کو بھی سائے اور تعویذ کا نتیجہ تصور کرتی ہے Rickets ___ اور کئی دیگر امراض میں مبتلا سوکھے بچوں کو سردیوں کے موسم میں صبح چار بجے پیروں فقیروں کے استھانوں پر گندے جوہڑوں میں نہلایا جاتا ہے۔ تاکہ پیر فقیر ان بچوں کی مشکل کو حل کر دیں۔ علاج کا یہ طریقہ کافی ''کامیاب'' ہے کیونکہ یہ مشکل اکثر اوقات نمونیے کے ذریعے سے حل ہو جاتی ہے) ہڈیوں کے علاوہ چونے کی کمی سے بچوں کے دانت ناقص بنتے ہیں۔ جب یہ دانت پیدائش کے بعد اُگتے ہیں تو ان میں جلد ہی (Caties) کا مرض ہو جاتا ہے جس سے دانتوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ دودھ کے دانتوں کی تعمیر ماں کے پیٹ میں حمل کے سترہویں ہفتے میں اور مستقل دانتوں کی تعمیر حمل کے آخری مہینوں میں شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا پیدائش کے بعد بچے کو کیلشیم یا وٹامن ڈی کھلانے سے دانتوں کی کمزوری دُور نہیں کی جاسکتی۔ ضروری ہے کہ ماں زمانہء حمل میں کیلشیم کی کمی کا شکار نہ ہونے پائے۔ سوا سیر دودھ میں 1،4 یعنی 1 2/5 گرام کیلشیم ہوتا ہے۔ بقایا کیلشیم پنیر، سبزیوں اور ہرے پتوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کیلشیم اناج میں بھی پایا جاتا ہے مگر یہ خون میں جذب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اناج دودھ میں پائے جانے والے کیلشیم کو بھی خون میں جذب ہونے سے روک سکتا ہے۔ وٹامن ڈی (Vitamin D) کی عدم موجودگی میں کیلشیم انتڑیوں سے خون میں جذب نہیں ہوتا، اس لئے اس کی کمی سے جسم میں کیلشیم کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیز وٹامن ڈی کے بغیر کیلشیم ہڈی بنانے میں استعمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے دوا ساز کمپنیاں اسے کیلشیم کی گولیوں میں شامل کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی مرکب گولیاں مثلاً ڈیگرا کمپنی کی Dagravit-D-Calcium___ حاملہ عورتوں اور بچوں کے لئے بہت مفید ہیں۔ اور ٹافی کی مانند خوش ذائقہ بھی ہیں۔ قیمت فی عدد دو پرانے پیسے۔ لوہا خون کا اہم جزو ہے یہ دودھ میں کافی مقدار میں نہیں پایا جاتا۔ اگر حاملہ عورت کی خوراک میں لوہا 15 ملی گرام روزانہ سے کم ہو تو قلتِ خون___ Anaemia کی بیماری ہو جاتی ہے۔ جس سے اسقاط حمل اور عورت کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

نیز بچے کے جسم میں لوہے کا ذخیرہ نہیں ہو پاتا اس لئے اگر اسقاط نہ ہو تو بچہ اپنی زندگی کے پہلے سال کے اندر اندر خون کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے چند ماہ بچے کی خوراک صرف دودھ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور دودھ میں لوہا کافی نہیں ہوتا۔ نتیجتاً بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس میں بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہتی۔ اور وہ کسی نہ کسی بیماری سے مر جاتا ہے۔

(3) لوہا (Iron)، گوشت خصوصاً جگر، انڈہ، آلو، پھل، پھلیوں، شلغم، مٹر، پالک اور اناج میں پایا جاتا ہے۔ اگر حاملہ عورت میں خون کی کمی ہو جائے تو اسے لوہا ادویات کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ طبِ جدید میں لوہے کے کئی سالٹ مستعمل ہیں۔ فیرس سلفیٹ دیگر خون پیدا کرنے والے اجزاء کے ہمراہ گولیوں (Fersolate) کی صورت میں ملتا ہے۔ ایک گولی کی قیمت ایک پیسہ ہے۔ لوہے کا ایک اور اچھا سالٹ فیری ایٹ امونیا سائی ٹراس (Ferriet Ammon Citras) ہے اسے مکسچر کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی قیمت دو اڑھائی آنے فی تولہ ہے۔ ایک تولے سے دوا کی بیس خوراکیں تیار ہو جاتی ہیں۔ ہماری زبان میں ان مرکبات کو کشتے کہا جاتا ہے اور اس نام سے یہ بہت مہنگے داموں بکتے ہیں۔ قوم کے بعض ''خادموں'' نے سادہ لوح عوام کے لئے قسم قسم کے شربتِ فولاد بھی تیار کر رکھے ہیں۔ دو آنے کا لوہے کا کوئی سا سالٹ لے کر اس میں تھوڑی سی چینی ملا کر پانی ڈال دینے سے شربتِ فولاد کی پوری بوتل تیار ہو جاتی ہے اس قسم کے شربت ہمارے ملک میں بہت بکتے ہیں۔ ہر بیوقوف تین روپے میں بوتل خرید سکتا ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

(4) وٹامن اے (Vitamin A) دودھ مکھن کریم، تازہ سبز پتوں، گاجروں، جگر اور مچھلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے تیل میں پائی جاتی ہے۔اس کی کمی سے بچے کی آنکھیں خراب ہوسکتی ہیں۔ نیز وضعِ حمل کے بعد چھوت کے بخار (Puerpetal Sepsis) کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔اس بخار سے ہمارے ملک میں کافی موتیں واقع ہوتی ہیں۔

(5) وٹامن بی کمپلیکس (Vitamin B Complex) بہت سی وٹامنز کا ایک گروہ ہے۔ ان کی کمی سے اعصابی درد، قبض، گردے کی سوزش، پتے کی سوزش اور پتھری، وضعِ حمل میں دِقّت اور وضعِ حمل کے بعد جریانِ خون کی شکایت پیدا ہوسکتی ہے۔زبان، ہونٹوں، آنکھوں اور جلد کے امراض اور ہاضمے کی خرابیاں بھی لاحق ہوسکتی ہیں۔Eclampsia کے مرض میں بھی وٹامن بی کی کمی کو دخل ہے۔ نیز اس وٹامن کی کمی سے زمانہء حمل میں لوہے کی موجودگی میں بھی قِلت خون کا مرض لاحق ہوسکتا ہے۔قلتِ خون کی یہ قسم صرف ہمارے ہی جیسے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔اسے (Tropical Anaemia of Pregnancy) کہتے ہیں۔اس مرض میں لوہے کے مرکبات کھلانے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ وٹامن بی پنیر، انڈہ، گوشت، جگر، پھلی دار سبزیوں، آلو، سالم اناج (مشین کے آٹے میں نہیں) اور یسیٹ (Yeast) میں پائی جاتی ہے۔

(6) وٹامن ''سی'' (Vitamin C) آلو، سبز پتوں اور تازہ پھلوں خصوصاً سنگترے، مالٹے، لیموں، چکوترے وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔زمانہء حمل میں روزانہ دو سنگتروں یا مالٹوں کا استعمال ضروری ہے (بشرطیکہ وہ آلو رکھنے کے کولڈ سٹوریج میں نہ رکھے گئے ہوں۔اس صورت میں شاید روزانہ چھ یا بارہ مالٹے بھی ناکافی ثابت ہوں گے) وٹامن ''سی'' کی کمی سے (Scurvy) کا مرض ہوجاتا ہے۔جریانِ خون اور اسقاط حمل میں بھی وٹامن ''سی'' کی کمی کو غالباً دخل ہے۔

(7) وٹامن ''ڈی'' (Vitamin D) کیلشیم کو انتڑیوں سے خون میں جذب کرنے اور مناسب طور پر ماں اور بچے کی ہڈیوں میں استعمال کے لئے ضروری ہے۔ یہ وٹامن دودھ، انڈے، مکھن اور مچھلی کے تیل میں پائی جاتی ہے، مگر خوراک کے علاوہ حاملہ عورت کو دوا کی صورت میں بھی ضرور دینی چاہئے۔ نیز بچے کو پیدائش سے لے کر پندرہ سال کی عمر تک دینا ضروری ہے۔اس کی کمی سے کیلشیم کی کمی واقع ہوتی ہے اور ہڈیوں کی بیماری (Rickets) لاحق ہوجاتی ہے ہڈیاں نرم ہوکر ٹیڑھی ہوجاتی ہیں۔ بچہ سوکھ جاتا ہے مگر اس کا پیٹ کافی بڑا ہوجاتا ہے۔پاخانے آتے ہیں اور کافی بچے ان عارضوں میں مبتلا ہوکر مرجاتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(8) نمک۔ زمانۂ حمل میں نمک کا استعمال کم کرنا چاہیے (Eclampsia) کی بیماری میں نمک کا بہت دخل ہے۔

(9) پانی کی مقدار پر کوئی پابندی نہیں۔

حاملہ عورت کے لئے مکمل خوراک کا خاکہ درج ذیل ہے:

دودھ	سواسیر روزانہ
سنگترے یا مالٹے	دوعدد روزانہ
انڈہ	1 عدد روزانہ
گوشت	2 چھٹانک روزانہ
مچھلی	ایک یا دو بار ہر ہفتے
کلیجی	ایک بار ہر ہفتے
مچھلی کا تیل	دو چمچے روزانہ
روٹی، چاول اور سبزیاں	جتنا جی چاہے

خوراک کے بعد کام کاج، آرام، نیند، ورزش، تفریح اور غسل توجہ طلب امور ہیں۔ حاملہ عورت کے لئے کھلی ہوا میں ورزش بہت مفید ہے۔ اس سے نیند اچھی آتی ہے۔ ہاضمے کو تقویت ملتی ہے۔ بدن میں چستی آتی ہے اور جی خوش رہتا ہے۔ کھیتوں کا کام جیسا کہ ہماری آبادی کی اکثریت کو کرنا پڑتا ہے، ورزش کی ذیل میں نہیں آتا۔ ایسی تھکا دینے والی سخت محنت مضر ہے۔ البتہ گھریلو کام حمل کے دوران میں جاری رکھنے چاہئیں۔ عورت اتنا کام نہ کرے جس سے تھکان ہو۔ مناسب آرام، ورزش سے بھی زیادہ اہم ہے۔ حمل کے آخری چار پانچ مہینوں میں دوپہر کے بعد دو تین گھنٹے بستر پر لیٹنا چاہیے۔ (پاؤں بستر سے نیچے نہ لٹکائے جائیں اور لباس ڈھیلا ڈھالا پہنا جائے) نویں ماہ میں، دن میں دو تین بار لیٹ کر آرام کرنا چاہیے۔ روزانہ نہانا ضروری ہے۔ آخری دو مہینوں میں باتھ ٹب میں لیٹ کر نہیں نہانا چاہیے۔ فوارے یا نلکے کے نیچے نہانا مناسب ہوگا۔ کھلے پانی میں تیرنا بھی درست نہیں۔ حمل کے دوران میں کسی قسم کا ڈوش نہیں کرنا چاہیے۔ روزانہ آٹھ گھنٹے سونا ضروری ہے۔ سردیوں کے موسم میں بھی کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان کھلے رکھنے چاہئیں۔ اور منہ کپڑوں میں نہیں لپیٹنا چاہیے۔ حمل کے آخری مہینوں میں سفر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہدایت خصوصاً ان عورتوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لئے بہت ضروری ہے جنہیں اسقاط ہوتا ہو۔ دانت صبح شام صاف کرنے چاہئیں۔ چھٹے مہینے سے چھاتیوں کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اپنی لیڈی ڈاکٹر سے ہدایات لیں۔ بچہ پیدا ہونے پر بعض عورتوں کی چھاتیوں میں ورم ہو جاتا ہے۔ یہ کافی تکلیف دہ مرض ہے اس کی اصل وجہ دودھ کا پستانوں میں ٹھہرے رہنا(Stagnation) ہے۔ اس لئے دودھ کو بچہ پیدا ہونے سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے ہی جاری کر دینا چاہئے اور مسلسل جاری رکھنا چاہئے۔ عورت کو یہ عمل خود اپنے ہاتھ سے روزانہ انجام دینا چاہئے۔ آخری تین مہینوں میں جنسی اختلاط سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس عرصہ میں عورتوں کا میکے جانے کا رواج اچھا ہے۔ اگر کسی عورت کو اسقاط ہو چکا ہو تو اسے حمل کی ساری مدت میں اس سے اجتناب لازمی ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچے کی نشوونما کا انحصار والدہ کی صحت اور خوراک پر ہے۔ اگر کسی عورت کے جلد جلد بچے پیدا ہوں تو اس کی صحت بگڑ جاتی ہے۔ نتیجتاً بہت سے حمل ساقط ہو جاتے ہیں اور جو ساقط نہیں ہوتے ان سے کمزور اولاد پیدا ہوتی ہے۔

آج جب کہ امریکہ اور روس ہائیڈروجن بم اور مصنوعی سیاروں کے معاملے میں اپنی مہارت کا ثبوت دے رہے ہیں، ہم نے بچے پیدا کرنے میں اپنی مہارت کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ یورپ والوں نے پاکٹ ماڈل کے ٹرانزسٹر ریڈیو تیار کئے ہیں۔ ہم نے ان سے کہیں زیادہ تعداد میں پاکٹ ماڈل کے بچے تیار کر دکھلائے ہیں۔ بچہ اگر پیدائش کے وقت صحت مند نہ ہو تو اس کا بچپن میں ہی کسی نہ کسی بیماری سے چل بسنا چنداں تعجب خیز نہیں۔ پاکستان میں ایک سال سے کم عمر میں مر جانے والے بچوں کی سالانہ تعداد پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ شرح اموات انگلستان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے مگر ہم ایسی باتوں سے بددل ہونے والے نہیں۔ ہم اپنا یہ فرض کمال تندہی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ کثیر العیال لوگوں کے بقول آخر قدرت نے عورت کو بنایا ہی کس لئے ہے۔ وہ تو بچے پیدا کرنے کی ایک مشین ہے، جسے بے کار رکھنا قدرت کے منشاء کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے! اسی لئے ہم نے منصوبہ بندی کے بورڈوں پر سیاہی پھیر دی ہے اور اگر بس چلا تو انہیں اکھاڑ پھینکنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔

پہلی زچگی کے بعد دوسرے، تیسرے اور چوتھے حمل کے دوران میں وضع حمل میں تکالیف کم ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ تکالیف بتدریج بڑھتی جاتی ہیں۔ بچے کو عدم سے وجود میں لانا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی مذاق نہیں۔ یہ ایک کٹھن کام ہے اور اس کے لئے عورت کو خاصی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ چار بچوں کی پیدائش کے بعد صحت کمزور ہونے لگتی ہے۔ ہڈیاں کھوکھلی (Osteoporotic) ہو جاتی ہیں۔ رحم کی سکڑنے اور بچے کو باہر نکالنے کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے، اسے رحم کا جمود (Uterine Inertia) کہتے ہیں۔ اس سے وضعِ حمل کا عمل طویل ہو جاتا ہے اور اس عرصے میں جریانِ خون اور دیگر مشکلات کے باعث زچہ اور بچہ دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اکثر حالتوں میں نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔ کیا کمزور بچے پیدا کرنے اور عورت کو بار بار موت کے منہ میں جھونکنے سے کہیں بہتر یہ نہیں کہ آپ کم تعداد میں مگر صحت مند بچے پیدا کریں۔ ویسے اگر منصوبہ بندی کے بورڈوں پر سیاہی پھیرے بغیر آپ کا ''ایمان'' تازہ نہیں ہوتا تو آپ بے شک یہ شغل جاری رکھیں۔ زمین سے چھ فٹ نیچے دبے ہوئے لاکھوں بچے اور عورتیں آپ کا ہاتھ روکنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔

بچے اور ماں کی کمزوری کا دوسرا سبب ماں کی کم عمری ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں لڑکیوں کو اگرچہ حیض بارہ سے پندرہ سال کی عمر میں آنا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ سلامتی سے بچہ پیدا کرنے کے قابل اسی عمر میں نہیں ہو جاتیں۔ اُس وقت لڑکی کے جسم اور کولھوں کے استخوانی ڈھانچے میں وہ تبدیلیاں شروع ہوتی ہیں۔ جو بالآخر اس کے جسم کو ایک بالغ عورت کے جسم میں تبدیل کرتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں فوری نہیں ہوتیں بلکہ انہیں تین چار سال کا عرصہ درکار ہے۔ تب کہیں جا کر عورت سلامتی سے صحت مند بچہ پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ حیض آنے کی عمر کو (age of puberty) کہتے ہیں اور حمل اور وضعِ حمل کے قابل ہونے کی عمر کو (age of nubility) کہتے ہیں۔ ان دونوں مدارج میں تقریباً چار سال کا فرق ہے۔ لہٰذا ہمارے ملک میں شادی کی مناسب عمر اٹھارہ انیس سال اور کم از کم عمر سولہ سال ہے۔ مگر ع

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن

پر مرنا ہماری پرانی روایت ہے اور ہم کم سن لڑکیوں سے اجتناب کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

بچے کے صحت مند ہونے کا انحصار باپ کی صحت اور عمر پر بھی ہے۔ ہمارے ملک میں ساٹھ ساٹھ سال کے امیر بوڑھے نوجوان لڑکیوں سے شادی رچا لیتے ہیں۔ کیونکہ پرانے زمانے کی طرح اب بھی ہماری سوسائٹی میں عورت کو گائے بھینس کی طرح ملکیت کی ایک چیز سمجھا جاتا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(قدیم عبرانی کتابوں میں بیوی کو بیولہ کہا گیا ہے جس کے معنی ''ذاتی ملکیت'' کے ہیں) قدیم زمانے میں نوجوان باکرہ لڑکی کو بوڑھوں کے بیشتر امراض کا علاج سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ دل فریب نسخہ قدیم مذہبی کتابوں میں بھی درج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لینے سے بوڑھے آدمی کی زندگی کئی سال بڑھ جاتی ہے۔ یہ تو پتہ نہیں کہ بوڑھے کی زندگی واقعی بڑھتی ہے یا نہیں ___ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اس سے نوجوان لڑکی کی زندگی کم ہو جاتی ہے۔ اسے بھی بیچاری لڑکی کی خوش قسمتی ہی قرار دینا چاہئے کیونکہ ایسی زندگی ایک مسلسل عذاب ہے۔

بڑھاپے کی اولاد نہ صرف جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہے بلکہ دماغی نقائص بھی ایسے بچوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں لیکن یہ گھبرانے کی بات نہیں۔ آخر دیوانوں کو دیوانگی سے کیا ڈر۔ ہمارے بچوں کو کون سا چاند اور ستارے فتح کرنے ہیں۔ جو ہم ان کی ذہنی صلاحیتوں کا خیال رکھیں۔ علم و دانش کے کام تو ہم ایک مدت سے مغرب کے سپرد کر چکے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ ماننے کی کیا ضرورت ہے کہ مرد اور عورت کی عمر میں بیس سال سے زیادہ کا فرق نہ ہونا چاہئے۔

حمل کے دوران میں عورت کو کئی قسم کی تکالیف لاحق ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے بعض معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں اور بعض بچے کے لئے یا بچے اور ماں دونوں کے لئے خطرناک یا مہلک ہوتی ہیں۔ ہاضمے کی خرابی، قبض، معمولی قسم کی متلی اور قے بہت عام ہیں۔ متلی اور قے کی تکلیف حمل کے ابتدائی مہینوں میں ہوتی ہے اور تین ماہ کے اندر ہی رفع ہو جاتی ہے۔ اکثر یہ تکلیف صرف صبح کے وقت ہوتی ہے اور اسے صبح کی بیماری (Morning Sickness of Pregnancy) کہتے ہیں۔ صبح آنکھ کھلتے ہی بسکٹ یا توسٹ بغیر کسی مشروب (از قسم دودھ، پانی، چائے) کے کھا لینا اس کا بہترین علاج ہے۔ نیز کھانے کے ہمراہ کوئی پینے کی چیز استعمال نہ کریں اور پینے کی کسی چیز کے ہمراہ کوئی ٹھوس خوراک نہ کھائیں۔ بعض عورتوں میں یہ معمولی تکلیف باقاعدہ مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جسے (Hyperemesis gravidarum) کہتے ہیں۔ اس میں متلی دن بھر رہتی ہے اور قے بار بار ہوتی ہے، سب کچھ کھایا پیا نکل جاتا ہے، بغیر کچھ کھائے پیے بھی قے ہوتی ہے اور بار بار دل ڈوبتا ہے، رفتہ رفتہ حالت زیادہ خراب ہو جاتی ہے، جسم سوکھ جاتا ہے، دل کمزور ہو جاتا ہے، گردے کا فعل خراب ہو جاتا ہے، خون میں زہریلے مادے جمع ہو جاتے ہیں، یرقان ہو جاتا ہے، آنکھوں کی بصارت ختم ہو جاتی ہے، غشی طاری ہو جاتی ہے اور مریضہ انتقال کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتی ہے۔لہذا متلی اور قے کو غیر اہم سمجھ کر اس کی طرف سے غفلت نہیں برتنا چاہیے بلکہ شروع ہی میں اس کا علاج کروانا چاہیے۔ کیونکہ ابتدائی درجے میں اس پر قابو پالینا جتنا آسان ہے بعد میں اتنا ہی مشکل۔

قبض کے لئے سنا کی پھلیاں (Senna Pools) یا لیکوئڈ پیرافن (Liquid Paraffin) اچھی ادویات ہیں۔ زمانہء حمل میں سخت جلاب نقصان دہ ہوتے ہیں، ان سے اسقاط حمل کا خطرہ ہوتا ہے۔

حمل کے دوران میں پیٹ کے نچلے حصے میں درد اور خون کا جاری ہونا اسقاطِ حمل کی ابتدائی علامات ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک ہزار سے زیادہ حمل ہر روز ساقط ہوتے ہیں اور بے شمار عورتیں مر جاتی ہیں۔حمل گرنے کے بہت سے اسباب ہیں: عورتوں کی کم عمری، جسمانی کمزوری، ناکافی خوراک اور جسم میں خون کی کمی بہت عام وجوہ ہیں۔ نیز بہت سے اسقاط ملیریا بخار کی وجہ سے ہوتے ہیں۔چونکہ آج سے بیس سال قبل ملیریا کے علاج کے لئے صرف کونین ہی ایک موثر دوا تھی اور عام طور پر یہی استعمال ہوتی تھی، اس لئے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اسقاط کونین کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ خیال فی الحقیقت درست نہیں، کیونکہ کونین، ملیریا کی موجودگی میں رحم پر کوئی اثر نہیں رکھتی۔ملیریا میں اسقاطِ حمل ملیریا کے زہر (Malarial Toxin) اور ملیریا سے پیدا ہونے والی قلت خون (Anaemia) کے باعث ہوتا ہے۔کونین سے ملیریا کا علاج کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔لیکن آج کل حمل سے قطع نظر ملیریا میں کونین کا استعمال یوں بھی کم ہوتا جارہا ہے کیوں کہ بہت سی نئی دوائیں مثلاً میپا کرین اور ریزوشین تیار کی جا چکی ہیں۔ اسقاط کا ایک اور سبب آتشک (Syphilis) ہے۔ اگر آتشک زدہ عورت کو اسقاط نہ ہو تو بچہ آتشک کا پیدائشی مریض ہوتا ہے۔سخت مشقت اور جذباتی ہیجان بھی اسقاط کے محرک ہوتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اسقاط حمل کا ایک اور سبب بھی ہے، جس کی تحریک ہمارے اکثر گھرانوں میں ایک اصول کے تحت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔ یہ مردوں کے ہاتھوں عورت کی ''خاطر تواضع'' ہے۔ ''خاطر تواضع'' کی رنگا رنگ قسمیں ہیں جو کبھی مکوں اور کبھی لاتوں اور ڈنڈوں سے بروئے کار آتی ہیں۔اس کے علاوہ اتفاقیہ طور پر گر پڑنے یا چوٹ لگ جانے سے بھی اسقاط ہو سکتا ہے۔ آخری تین ماہ میں جنسی اختلاط بھی حمل گرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عورت کے اندرونی اعضاء کی خرابیاں بھی اسقاط کا باعث بن سکتی ہیں۔ اسقاط کی علامات جب بھی ظاہر ہوں، لیڈی ڈاکٹر یا ڈاکٹر کی خدمات فوری طور پر حاصل کرنی چاہئیں۔ جن عورتوں کو بار بار اسقاط ہوتا ہو انہیں مکمل ڈاکٹری معائنہ کروانا چاہئے اور حمل کے دوران میں لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں رہنا چاہئے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسقاط کا ایک سبب مرد کا ناقص مادۂ منویہ بھی ہے۔ لہٰذا مرد کا ڈاکٹری معائنہ بھی ضروری ہے۔ اسی طرح آتشک کے معاملے میں عورت کے علاج کے ساتھ مرد کا علاج کرنا چاہئے کیونکہ اگر عورت کو آتشک ہو تو مرد کو بھی ہوتی ہے۔ عموماً مرد ہی یہ تمغہ باہر سے جیت کر گھر میں لاتے ہیں۔

حمل کے زہر کی بیماریاں

(Pre-eclamptic Toxaemia) اور Eclampsia ایک ہی بیماری کے دو درجے ہیں۔ یہ بیماری دوسرے درجے میں عموماً مہلک ہوتی ہے۔ مرض چھٹے مہینے شروع ہوتا ہے، خون کے دباؤ کا بڑھ جانا، پیشاب میں اجزائے لحمیہ (البومن Albumin) کا پایا جانا اور جسمانی سُوجن اس کی خاص علامات ہیں۔ سُوجن پاؤں اور ٹخنوں سے شروع ہوتی ہے۔ بعد میں ٹانگوں، ہاتھوں، چہرے اور پیٹ تک پھیل جاتی ہے۔ پھر پیشاب کی کمی، سر درد، چکر آنا اور قے کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ سر درد بہت شدید ہو سکتا ہے۔ نظر کی کمزوری، ایک چیز کا دو نظر آنا، آنکھوں کے سامنے دھبّوں اور شعلوں کا دکھائی دینا، نیم بے ہوشی اور پیٹ کے اوپر کے حصے میں درد، بعد کی علامات ہیں اور بہت بُری ہیں۔ ان کے ظاہر ہونے کے بعد مرض جلد ہی دوسرے درجے میں پہنچ جاتا ہے جس میں دَورے پڑتے ہیں۔ دورہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ مریض کی آنکھیں اِدھر اُدھر حرکت کرتی ہیں، چہرے اور ہاتھوں کے عضلات بار بار پھڑکتے ہیں۔ یہ کیفیت کوئی آدھ منٹ رہتی ہے۔ اس کے بعد مریض کا سارا جسم لکڑی کی مانند سخت ہو جاتا ہے، چہرہ بدنما صورت اختیار کر لیتا ہے، آنکھیں باہر نکل آتی ہیں، ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو جاتی ہیں۔ یہ کیفیت بھی کوئی آدھ منٹ تک رہتی ہے۔ اس کے بعد ٹانگیں اور بازو جھٹکے سے حرکت کرنے لگتے ہیں، زبان دانتوں کے نیچے آ کر کٹ جاتی ہے، چہرہ نیلا پڑ جاتا ہے، سانس رُک رُک کر آتا ہے۔ منہ سے جھاگ نکلتا ہے، پیشاب پاخانہ کا اخراج غیر ارادی طور پر ہوتا ہے۔ یہ حالت کوئی ایک منٹ تک رہتی ہے۔ اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعد مریضہ بے ہوش ہو جاتی ہے، بے ہوشی کئی گھنٹے رہ سکتی ہے، اس کے بعد یا تو ہوش آ جاتا ہے یا اسی حالت میں دوسرا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر مریض کو دورے اور اس سے کچھ وقت پہلے کے واقعات یاد نہیں رہتے۔ ایک مریضہ کو ایک یا دو سے لے کر دو سو تک دورے پڑ سکتے ہیں۔ 65 فی صد مریضوں میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے، 20 فی صد میں وضع حمل کے دوران میں اور 15 فی صد میں بچہ پیدا ہو چکنے کے بعد دورے شروع ہوتے ہیں۔ اگر بچہ پیدا ہونے سے پہلے دورہ پڑے تو اسی حالت میں وضع حمل شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ عام طور پر مر جاتا ہے اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ لوگ اسے مرض کی بجائے بھوت پریت کا اثر سمجھتے ہیں اور دم پھونک کرتے کراتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ "جن" ذرا سخت واقع ہُوا ہے، کسی کالے علم کو نہیں مانتا۔ یہ مرض قابلِ علاج ہے۔ تقریباً صد فی صد مریضوں کو شفا ہو سکتی ہے اور دورے کو روکا جا سکتا ہے، بشرطیکہ علاج ابتدائی درجے میں کیا جائے۔ دورے شروع ہو جانے کے بعد علاج کے باوجود 25 فی صد عورتیں اور 50 فی صد بچے مر جاتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی علامات پر نظر رکھنی چاہیے، اگر حاملہ عورت کے وزن میں کسی ایک ماہ میں ڈھائی سیر سے زیادہ کا اضافہ ہو (خواہ ظاہرا طور پر سوجن نظر نہ آئے) یا قمیض کا گلا تنگ محسوس ہونے لگے یا انگشتری انگلی میں پھنسی ہوئی معلوم ہونے لگے تو فوراً لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کروانا چاہیے۔

بعض عورتوں میں پیٹ کا دائرہ حمل کی مدت کی نسبت سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ ایک سبب تو پیٹ میں ایک سے زیادہ بچوں کا ہونا ہے۔ یہ کوئی بیماری نہیں، مگر ڈاکٹری معائنے کے ذریعے اس کی تصدیق ضروری ہے۔ نیز وضع حمل ہسپتال میں یا لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔ دوسرا سبب بچے کے گرد لپٹی ہوئی جھلی میں پانی کی مقدار کی زیادتی ہے اسے (Hydramnuos) کہتے ہیں۔ یہ مرض بچے کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دیگر امراض اور رسولیاں بھی پیٹ کا وزن بڑھا سکتی ہیں لہٰذا ڈاکٹری معائنہ ضروری ہوتا ہے۔

بعض حالات میں وضع حمل نہایت آسانی سے ہو جاتا ہے، مگر بعض اوقات خاصی مشکلات پیش آ سکتی ہیں، چنانچہ عورتوں اور بچوں کی کثیر تعداد مر جاتی ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی غلط پوزیشن، ایک سے زیادہ بچوں کا ہونا، عورت اور بچے کی کمزور صحت، رحم کا جمود، خون کا ضیاع، بچے کے سر کا ماں کے استخوانی ڈھانچے سے بڑا ہونا، اول (Placenta) کا رحم کے منہ پر یا اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قریب واقع ہونا اور وضع حمل کے بعد چھوت کا بخار، اس کے چند اسباب ہیں۔ بعض صورتوں میں بچے کو اوزاروں کی مدد سے یا عورت کا پیٹ چیر کر نکالنا پڑتا ہے، اور اگر ایسا کرنے کے انتظامات نہ ہوں تو عورت اور بچے دونوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

پس حمل کے دوران میں یا وضع حمل کے وقت ہونے والی تکلیفوں کا بہترین علاج یہ ہے کہ ہر حاملہ عورت لیڈی ڈاکٹر کی نگرانی میں رہے۔ ہمارے ملک میں بھی اس مقصد کے لئے زچہ اور بچہ کی بہبودی کے مرکز قائم ہیں، مگر لوگ ان سے کما حقہ، فائدہ نہیں اٹھاتے۔ حاملہ عورت کو حمل کی ابتداء سے تیسویں ہفتے تک ہر ماہ اپنے مرکز میں برائے معائنہ حاضر ہونا چاہئے۔ اس کے بعد چھتیسویں ہفتے تک ہر دو ہفتے بعد اور اس کے بعد ہر ہفتے۔ یہ معائنہ اور مشورہ مفت ہوتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نہ صرف دورانِ حمل کے امراض کی تشخیص اور ان امراض کا علاج کرتی ہے بلکہ وضع حمل میں پیش آنے والی مشکلات کا بھی اندازہ کر کے مناسب ہدایات دے سکتی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بچے کی نشوونما اور ماں کی صحت پر نظر رکھتی ہے۔ اس کے وزن، قارورے اور خون کے دباؤ کی جانچ کرتی رہتی ہے۔ وہ دیکھ لیتی ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ ایک ہی ہے یا ایک سے زیادہ ہیں۔ عورت کے استخوانی راستے کی پیمائش کرتی ہے۔ بچے کی پوزیشن، اس کے ننھے سے دل کی حرکت اور اس کے قد کاٹھ پر نظر رکھتی ہے اور اگر ضرورت پڑے تو ایکسرے کے ذریعے بچوں کی تعداد، ان کی پوزیشن، بچے کے سر اور عورت کے استخوانی راستے میں تناسب یا عدم تناسب، بچے کے جسمانی نقائص اور اول کی پوزیشن کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس طرح حمل کے امراض اور وضع حمل میں پیش آنے والے حادثات کو روکا جا سکتا ہے۔ نیز جسمانی مرض سے قطع نظر ایسے مرکزوں میں آنے والی عورتوں کے لئے وضع حمل کے مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وضع حمل کے درد میں اعصابی تناؤ اور خوف کا بہت حصہ ہے۔ لیڈی ڈاکٹر وضع حمل کے متعلق بھی ہدایات دیتی ہے اور اس طرح اسے جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے وضع حمل کے لئے تیار کر دیتی ہے۔

ہمارے عوام میں بچے کی صنف کے متعلق بہت سے توہمات پائے جاتے ہیں۔ اگر کسی عورت کو لڑکیاں ہی پیدا ہوں تو ہم اللہ کی رضا پر شاکر رہنے والے لوگ اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ بچے کی صنف، حمل قرار پانے کے وقت ہی متعین ہو جاتی ہے۔ اس میں عورت کی مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہیں اور نہ ہی اشتہاری ادویات یا جادو ٹونے سے اسے حسب خواہش بدلنا ممکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔کل بچوں میں ہر دو اصناف کی تعداد تقریباً برابر ہوتی ہے۔ کسی عورت کے ہاں زیادہ لڑکیوں یا لڑکوں یا صرف لڑکوں یا محض لڑکیوں کا پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے۔عورت کے تمام بیضے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ بچے کی صنف مرد کے مادۂ منویہ کے کرم سے متعین ہوتی ہے۔ یہ کرم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو نر بچے کو جنم دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو مادہ بچہ پیدا کرتے ہیں۔ دونوں قسموں کی تعداد آپس میں برابر ہوتی ہے۔ یہ کرم مادۂ منویہ میں کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک کرم عورت کے بیضے سے مل کر اسے حاملہ کرتا ہے۔ لہٰذا بچے کی صنف متعین کرنے میں عورت کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ لڑکی پیدا ہونے پر عورت کو موردِ الزام ٹھہرانا جہالت اور ظلم کی انتہا ہے۔ پچھلے دنوں جہلم کی ایک خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ ایک عورت کو چار دفعہ لڑکیاں پیدا ہوئیں، پانچویں حمل کے دوران میں خاوند نے کہا کہ اگر اب کے پھر لڑکی جنی تو میں تجھے یعنی بیوی کو قتل کر دوں گا۔ حمل کی مدت بڑھنے کے ساتھ دھمکیوں کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب عورت پر ہولناک خوف مسلط ہو گیا تو اس نے خودکشی کے ارادے سے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ وہیں کنویں میں اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے لوگوں نے زچہ بچہ کو مرنے سے پیشتر کنویں سے نکال لیا۔ خودکشی کرنا ہمارے قانون میں جرم ہے، مگر معلوم نہیں کسی کو خودکشی پر مجبور کرنا بھی جرم ہے یا نہیں؟ کیا فرماتے ہیں قانون دان حضرات بیچ اس مسئلے کے؟

بانجھ پن (Sterility) کا مسئلہ ایک الگ موضوع ہے، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، اگر کسی عورت کو شادی کے دو چار سال کے اندر بچہ پیدا نہ ہو تو ہم لوگ علاج کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اسے بانجھ سمجھ کر کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ بانجھ عورت نہیں ہوتی بانجھ شادی ہوتی ہے۔ دو چار سال تو رہے ایک طرف، اگر شادی کے پندرہ سال بھی کسی عورت کے یہاں اولاد نہ ہو تو اس کا بانجھ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ایسی مثالیں بہت عام ہیں کہ عورت کو شادی سے بیس بائیس سال بعد، چالیس سال کی عمر میں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ ایسی مثالیں بھی عام ہیں کہ مرد بچہ نہ ہونے پر متعدد شادیاں کرتا ہے مگر پھر بھی اولاد سے محروم رہتا ہے۔ وہ شادی پر شادی کرتا چلا جاتا ہے مگر اپنا طبی معائنہ نہیں کرواتا۔ اس طرح بے شمار تندرست عورتوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ بانجھ پن کی متعدد وجوہ ہیں۔ نقص عورت میں بھی ہو سکتا ہے اور مرد میں بھی۔ زنانہ اور مردانہ نقائص میں فرق البتہ یہ ہے کہ عورتوں کے بہت سے نقائص قابلِ علاج ہوتے ہیں مگر مردانہ نقائص بہت کم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قابلِ علاج ہوتے ہیں۔لہٰذا بانجھ پن میں میاں بیوی دونوں کا ڈاکٹری معائنہ ہونا چاہیے۔

عورت میں بانجھ پن کا ایک سبب سوزاک (gonorrhoea) کی وجہ سے رحم کی نالیوں کا بند ہو جانا ہے۔ یہاں یہ اَمر قابلِ ذکر ہے کہ سوزاک گھر میں پیدا نہیں ہوتا، اسے مرد ہی باہر سے درآمد کرتا ہے۔شروع میں اس کا علاج بہت آسان ہے لیکن جب اس سے رحم کی نالیاں بند ہو جائیں تو علاج کارگر نہیں ہوتا اور اچھی بھلی سہاگن بیوہ سے بدتر ہو جاتی ہے۔طوائفوں میں بانجھ پن کی کثرت کی ایک بڑی وجہ سوزاک ہی ہے۔سوزاک کی مریضہ کی نالیاں جب تک بند نہ ہوں وہ بچہ جَن سکتی ہے مگر اس صورت میں بچے کی آنکھوں کے خراب ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اور بہت سے بچے اندھے ہو جاتے ہیں۔سوزاک مرد کو بھی بانجھ کر سکتا ہے۔لہٰذا قوم کے ''فرہادوں'' کو اس سے ڈرنا چاہیے۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیدائش کے بعد، سکول سے پہلے

پروفیسر بیگم صفیہ جمیل

پیدائش کے وقت جو ننھا انسان دنیا میں آتا ہے اُس کی ہستی تقریباً چھتیس (36) ہفتے پہلے ایک واحد خلیے پر مشتمل ہوتی ہے۔ نومولود بے حد بیکس اور مجبور دکھائی دیتا ہے اور اُس کی بہت سی حرکات بے مقصد معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فوراً ہی وہ ماں کے بطن سے باہر کی دنیا سے مطابقت پیدا کر کے زندگی پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ بہت جلد اُس کی حرکات و افعال میں شعور اور سلیقہ آجاتا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں بلکہ چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ یکتا شخصی خصوصیات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ ایک یا دو سال کے اندر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مستحکم باہمی رشتہ قائم کر لیتا ہے ___ وہ شیر خواری کے زمانے ہی میں اپنے اندر جذبات کا سیلاب اُمڈتا ہوا محسوس کرتا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا ہے اُس کی دنیا کے آفاق میں وسعت پیدا ہونے لگتی ہے۔

زندگی بھر ایک بچے کو اسی طرح اپنے بدلتے ہوئے ماحول اور بڑھتے ہوئے جسمانی تقاضوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن توافق کے لحاظ سے سب سے اہم وقت پیدائش کا ہے، جبکہ بچہ کسی دوسرے انسان کے جسم سے غذا حاصل کرنے کے بعد ایک خودکفیل فرد کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اپنے ماحول سے توافق قائم کرنے کے دوران میں نومولود کا وزن عام طور پر کم ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے افعال اور شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا سے ہم آہنگی حاصل کرنے میں اُسے کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ حالت ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہتی۔ ایک ہفتے کے بعد وزن پھر بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔

کوئی سے دو بچے ایک ہی وقت میں اور بالکل ایک ہی عمر میں ماحول سے توافق پیدا نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے۔ نومولود کی نشوونما کی رفتار اور سمت کا انحصار اُس کی پیدائش سے پہلے اور بعد کی فضا پر ہے۔ اگرچہ وہ اپنی تمام فطری خصوصیات اپنے والدین سے حاصل کرتا ہے تاہم بحیثیت ایک انسان کے وہ اُن دونوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ماحول سے موافقت اور نشوونما ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ اُن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ایک دوسرے کے بغیر اُن کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بچے کی ذہنی اور جسمانی نشوونما ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ بچے کو ایک خاص قسم کا بالغ انسان بنانے میں اُس کے پیدائشی میلانات اور تجربات دونوں برابر کا حصہ لیتے ہیں۔

نومولود کا ماحول

نومولود کے گردوپیش کی بہت سی چیزیں اور حالات ایسے ہیں جن کا اُس کی زندگی پر اثر ہم سب پر واضح ہوتا ہے، لیکن بعض اثرات ایسے ہیں جو دکھائی نہیں دیتے۔ ہم بچے کے گھوارے کو تو دیکھ سکتے ہیں لیکن احساسات اور خیالات کے اُس غیر مرئی ماحول کو نہیں دیکھ سکتے جس میں گھوارے میں لیٹا ہوا بچہ سانس لے رہا ہے۔ ہمیں نومولود کے خاندان کے افراد کی وہ خواہشات، توقعات اور رویّے نظر نہیں آتے جن کا اُس کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اگر حالات اور جذبات کا مجموعہ بچے کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دنیا اُسے ایک اطمینان بخش مقام معلوم ہوگی، ایسا مقام جہاں اُس کی ماں اُسے دُنیا میں لانے پر فخر کرے اور اُس کی حفاظت میں اُسے خوشی محسوس ہو۔ اس کا باپ اس کی طرف ایسی کشش محسوس کرے جو اُس نے باپ بننے سے پہلے محسوس نہ کی ہو۔ جہاں بڑے بھائی بہن اُسے خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہوں، خواہ اُن سب کو اس کی پیدائش کے وقت کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو اور نئے انسان کو گھر میں جگہ دینے کے لئے گھر کی ترتیب میں کافی ردوبدل کرنے کی ضرورت ہوئی ہو۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے یہ ماحول بڑا غیر دوستانہ ہو۔ شاید نومولود کو قبول کرنے کے لئے بھائی بہن تیار نہ ہوں یا گھر کے لوگوں کے باہمی تعلقات خراب ہوں۔ ایسی فضا میں پیدا ہونے کے بعد بچہ اُس کے غیر مہمان نوازانہ جذبات کو جلد ہی خود اپنی زندگی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن بچے کی شخصیت کی تعمیر کا انحصار محض ماحول کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا۔ ابتداء ہی سے بچہ صرف ماحول کی تخلیق نہیں ہوتا بلکہ خود اپنا ماحول پیدا کرنے میں ممد ہوتا ہے۔ اُس کی کمزوری میں بھی طاقت ہوتی ہے۔ اُس کی بیکسی دوسروں کو اُس کی طرف رجوع کراتی ہے۔ اپنے چہرے اور طور طریقوں سے وہ زبردستی دوسروں کی توجہ حاصل کرتا ہے، اُن پر اثر ڈالتا ہے اور غیر شعوری طور پر اُن کے رویے بدل دیتا ہے۔ ایک عورت جو فخریہ یہ کہتی ہے کہ مجھے بچے پالنا ناپسند ہیں، ماں بننے کے بعد بچے کے پیچھے دن رات ایک کیے دیتی ہے۔ لیکن سیلاب کا یہ رُخ بدل بھی سکتا ہے۔ بعض والدین، بچے کی پیدائش سے پہلے، اپنے دماغ میں اُس کی صورت اور سیرت کا ایک شاندار تصور قائم کر لیتے ہیں، لیکن بچے کی پیدائش پر اُس کی اصل صورت دیکھ کر اُنہیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اُنہیں بچے کی پرورش کی ذمہ داری سے خوف آتا ہو۔ کئی والدین بڑے خشک مزاج اور بے تعلق قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ کسی انسان سے گہرا جذباتی رشتہ قائم کرنا نہیں جانتے، خواہ وہ اُن کا اپنا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

جس گھر میں یہ سب کچھ ممکن ہو، ظاہر ہے کہ وہاں کی فضا بچے کی صحیح نشوونما کے لئے بالکل سازگار نہیں۔

نومولود کا کردار

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے وقت بچے کے حواس خمسہ محض بے عمل نہیں ہوتے۔ وہ دباؤ اور حرارت کی تبدیلی کو محسوس کرتا ہے اور اس احساس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتا ہے۔ جہاں تک اُس کی آنکھوں کا تعلق ہے وہ ابھی مختلف اشکال اور رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتا لیکن اُسے روشنی کی تیزی اور گہرائی کا خفیف سا احساس ضرور ہوتا ہے۔ پیدائش کے چند ہفتے بعد وہ اُن چیزوں پر نظریں جما سکتا ہے جو بالکل اُس کے مقابل ہوں۔ اپنے کانوں سے وہ اُس وقت تک نہیں سن سکتا جب تک کانوں کا وہ پانی (amniotic fluid) نہ سوکھ جائے جو پیدائش کے دوران میں جمع ہو جاتا ہے۔ چند روز تک وہ صرف اونچی آوازیں سن سکتا ہے۔ لیکن بہت دنوں تک وہ آواز کی گہرائی اور سمت کا اندازہ نہیں کر سکتا ــــ اُس کے سونگھنے کی قوت بھی نہایت معمولی ہوتی ہے اور وہ صرف بہت تیز بو کو محسوس کرتا ہے۔ نومولود کی قوت ذائقہ اُن کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

دوسرے حواس خمسہ کی نسبت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ دودھ یا دوسری میٹھی چیزوں کو بڑی خوشی سے قبول کرتا ہے۔ مگر نمکین یا کھٹی چیزوں پر منہ بسورتا ہے۔ البتہ اگر اُسے بھوک نہ لگی ہو تو وہ دونوں قسم کی چیزوں کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ ان کا مزہ نہیں جانتا بلکہ اس لئے کہ اُسے کچھ کھانے پینے کی خواہش نہیں ہوتی۔

نومولود کے اعصاب میں بھی بتدریج ترقی ہوتی رہتی ہے۔ زندگی کی ابتداء ہی سے اس میں اپنی دنیا کی اشیاء کو ترتیب دینے اور اُن کی اہمیت کو جانچنے کی لگن اور قوت ہوتی ہے۔ وہ ایسے قدم اٹھاتا ہے جن سے اُس کی دنیا کے نظام کی سطح بلند تر ہوتی چلی جائے۔ اور اُس کے اس مقصد میں اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے محرکات اثر انداز ہوتے ہیں۔ جوں جوں بچے کی رگیں اور پٹھے پختہ اور مضبوط ہوتے ہیں، وہ اپنے ماحول اور خود اپنے اوپر اختیار حاصل کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کامیابی میں تجربے اور عمل کا بھی بہت حصہ ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت بچے کا سر جسم کی نسبت بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے بچے کی جسمانی پختگی کا عمل سر کی طرف سے شروع ہوتا ہے۔ ابتداء میں وہ دنیا کو اپنے منہ سے پہچانتا ہے اور منہ ہی کے ذریعے خوراک کی صورت میں اُس کی زندگی کی حفاظت شروع ہوتی ہے۔ ذرا بڑا ہونے پر وہ ہر چیز کو چکھنا چاہتا ہے اور منہ کے ذریعے دنیاوی اشیاء کی خصوصیات کو جانچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو اختیاری طور پر حرکت میں لانے سے پیشتر بچہ بانہوں اور ٹانگوں کو ہلانا سیکھتا ہے۔ دو سال کی عمر تک اُس کے لئے عضلہء حاصرہ (Sphincter) پر قابو پالینا ممکن نہیں ہوتا۔

زندگی کی اس بڑھتی ہوئی تنظیم کا مطلب یہ ہے کہ بچہ فالتو اور بے معنی حرکات کو ترک کر کے موقع سے متعلق اعمال کی طرف قدم بڑھائے، اُسے اپنے افعال پر اختیار حاصل ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کے اعصابی نظام میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ بچے کا بڑا مغز شروع میں زیادہ کام نہیں کرتا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ دماغ بھی بڑھتا ہے۔ طفلانہ حرکات بامعنی اور ماحول سے متعلق افعال کی صورت میں بدلنے لگتی ہیں۔

نومولود کے جذبات

زندگی کے پہلے ہفتے تک ایک ننھے انسان میں احساسات کے لئے کتنی استعداد ہوتی ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے بچہ اپنی بیرونی دنیا سے واقفیت حاصل کرتا ہے لیکن اپنے جذبات کے ذریعے اُسے اپنی ذات کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں ایک روتے چلاّتے، پیچ و تاب کھاتے اور ٹانگیں مارتے ہوئے ننھے بچے کو دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کے دل میں جذبات کا طوفان اُمڈ رہا ہے۔ بہت سے ماہرین نفسیات نے نومولود کے جذبات کے بارے میں تحقیق کی ہے اور اس سلسلے میں بہت سی قیاس آرائیاں بھی ہوئی ہیں لیکن ابھی تک کوئی کسی اطمینان بخش نتیجے تک نہیں پہنچ سکا۔

(freud) فرائڈ کا نظریہ یہ ہے کہ بچہ ابتداء ہی سے بڑے گہرے جذبات کی استعداد رکھتا ہے۔ ائزکس (Isaacs) کا خیال ہے کہ بچہ ابتداء ہی سے خواہشات، خوف، غصہ، نفرت اور محبت محسوس کرتا ہے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ بچہ دنیا میں اکیلا آتا ہے۔ اُسے شروع ہی سے خوف کا احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ان مشاہدوں کی مخالفت میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ بچہ ایک نامکمل ہستی ہے۔ اس لئے اس کے جذباتی تجربات بھی نہایت دھندلے ہوتے ہیں۔ یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ حقیقت کیا ہے، لیکن بچے کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اُس کے "جذبات" کا احترام کیا جائے اور اُن اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جن کے ذریعے وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً خوراک طلب کرنے کے لئے اُس کے رونے چلاّنے کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، خواہ وہ اُس کی ہستی کے مٹ جانے کے خطرے کا یا ہماری لاپروائی پر غصے کا یا ہماری بے تعلقی پر مایوسی کا اظہار ہو۔ رونا گویا اُس کے لئے ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ اپنے بہت سے کام نکال لیتا ہے۔ رونے کے ذریعے بچہ اپنی ضروریات، بے چینی، تکالیف اور ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ بے صبری اور رنج دکھانے کے لئے بھی وہ یہی ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

ابتدائی عمر ہی سے تمام صحت مند بچے خوب زور سے روتے ہیں لیکن اُن کے رونے چلاّنے میں بھی ہمیں اُن کی انفرادیت کے نشانات ملتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے حالات میں بعض بچے کم اور بعض بہت زیادہ روتے ہیں۔ اکثر بچے کے رونے کی وجوہات صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً زیادہ تر بچے بھوک لگنے یا گیلے ہو جانے کی وجہ سے روتے ہیں۔ لیکن بچوں کی تعداد کی ایک تہائی ایسی ہے جن کے رونے کی وجہ صرف اُن کو دیکھنے سے معلوم نہیں ہو سکتی ننھے بچوں کی زندگی کے پہلے تین مہینوں میں دردِ شکم (Colic) ایک عام شکایت ہے، اور ضروری نہیں کہ اِن

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی کوئی طبعی وجہ ہو۔ بعض دفعہ ماں اور بچے کے درمیان غیر مطمئن نفسیاتی رشتہ بھی دردِ شکم کا باعث بن سکتا ہے۔ ماں کا اضطراب بچے کی بے چینی کا باعث بن کر بچے کے ہاضمے میں خلل انداز ہو جاتا ہے۔ (Lakin) اور (Stewart) کے مطالعے کے مطابق دردِ شکم میں مبتلا بچوں کی مائیں دوسری ماؤں کی نسبت اپنی ماں ہونے کی حیثیت کو کم پسند کرتی ہیں یا بالکل قبول نہیں کرتیں۔ اُن میں خود اعتمادی بہت کم ہوتی ہے اور اُن کے تعلقات دوسرے لوگوں کے ساتھ زیادہ قابلِ اطمینان نہیں ہوتے۔

ابتدائی بچپن

جب ایک ننھا بچہ طفولیت کی بے کس اور مجبور حالت سے نکل کر اپنی مدد آپ اور خود اختیاری کے کردار کو اپناتا ہے تو اُس وقت اُس کے حرکت آفریں افعال اُس کی بہت مدد کرتے ہیں۔ اپنی آنکھوں اور بانہوں کے ابتدائی تجربات کی بنا پر وہ اپنی عقلی مستعدی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے ماحول کی چھان بین کرنے کے لائق بنتا ہے۔ اور یہی ابتدائی تجربات دوسرے بچوں سے اُس کے معاشرتی تعلقات مضبوط کرتے ہیں۔ عہدِ طفولیت ہی سے اُس میں اپنے گردوپیش کے حالات میں تنظیم پیدا کرنے اور دنیا کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے کی لگن ہوتی ہے۔ یہی تنظیمی طریقے اُسے اپنے شخصی استحکام کے متعلق ایک خاص نظریہ قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ جوں جوں بچے کی جسمانی تنظیم اور اختیار بڑھتا ہے، وہ اپنی قوتیں زیادہ وسیع تجربات کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اپنے سر کے پٹھوں پر قابو پاتے ہی وہ زیادہ سے زیادہ چیزوں کی طرف نظریں دوڑا سکتا ہے۔ وہ اب اتنا زیادہ اپنے والدین کے رحم و کرم پر نہیں ہوتا بلکہ خود ہاتھ بڑھا کر چیزیں تھام لیتا ہے۔ اعصاب اور پٹھوں میں توانائی آ جانے سے وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے۔ بلکہ آنے والے حالات کی پیش بینی بھی کر سکتا ہے۔ ماں کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل دیکھ کر وہ دودھ پینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور ٹب میں پانی ڈلتا دیکھ کر غسل کی توقع کرتا ہے۔

ماحول کی تحقیق و تفتیش

ایک چھوٹا بچہ اپنے ماحول اور انسانوں سے رشتہ قائم کر کے اُن کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے کے لئے اُسے اپنے گردوپیش کی اشیاء اور اشخاص کی چھان بین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتداء میں وہ اپنی قوتِ لامسہ کے ذریعے دنیا کی خصوصیات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

یہ چھان بین منہ سے شروع کرتا ہے کیونکہ اُس کی بصیرت ابھی کمزور ہوتی ہے۔ اُس کی گرفت بھی آٹھ ماہ کی عمر تک بالکل ہلکی سی ہوتی ہے۔ اپنے بازوؤں اور ہاتھوں پر قابو پانے کے بعد وہ پہلے اپنے پنگھوڑے گھوارے کی دنیا کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے اوپر لٹکے ہوئے کھلونے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب وہ اُس کی انگلیوں کے لمس سے ہلنے لگتا ہے تو اُسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس طرح اُسے دوسری چیزوں کو حرکت میں لانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ گھٹنوں چلتے وقت وہ خود کو متحرک حالت میں دیکھتا ہے۔ پہلے چیزوں کو اُس کے پاس پہنچایا جانا ضروری تھا، اب وہ خود کو متحرک حالت میں دیکھتا ہے۔ لیکن یہ رحمت بھی زحمت سے خالی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اب جبکہ اُس میں بہت کچھ چھونے، ہلانے اور اُٹھانے کی قوت آجاتی ہے تو اُسے چیزوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ملتی۔ ایک ماں سب ''خطرناک اور ضروری'' چیزوں کو اُٹھا کر کہیں اونچی جگہ پر رکھ دیتی ہے۔ دوسری اُسے کھیلنے کے جنگلے (Play Pen) میں بٹھا کر سکون حاصل کرتی ہے لیکن بچہ محض ایک تماشائی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کے متعلق جو تصور قائم کرتا ہے۔ اُسے موزونیت اور اطمینان کا جو احساس ہوتا ہے۔ اور جس کسوٹی پر وہ اپنے والدین کی اہمیت کو پرکھتا ہے وہ سب ماں باپ کے رویے پر منحصر ہوتے ہیں۔

مادی ماحول کے ساتھ بچے کے معاشرتی ماحول میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ ابتدا میں بچہ والدین کو محض اپنی ضروریات پوری کروانے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور اس طرح وہ اُن پر اور دوست کی طرح برتاؤ کرنے والے دوسرے انسانوں پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔

بولنے اور چلنے سے پہلے اُسے اپنی وقعت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔ ننھے بچے کی وہ دنیا جس میں لوگ بستے ہیں صرف اُن چند گنتی کے انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے جن سے وہ اچھی طرح مانوس ہو۔ اپنے خاندان کے افراد سے تعلق مستحکم کرنے کے بعد وہ دوسرے لوگوں سے ہمدردی اور محبت حاصل کرنے اور اس کا جواب ہمدردی اور محبت سے دینا شروع کر دیتا ہے۔ والدین اور بچوں کا یہ بندھن بچے کو خود اپنی نظروں میں محبت کے قابل بنانے اور اُسے موزونیت کا احساس دلانے میں بڑا معاون

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ثابت ہوتا ہے۔

بچہ صرف مادی ماحول کی چھان بین ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے جسم کی ساخت میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔ وہ اپنے منہ میں انگلی ڈال کر یا اپنا پاؤں تھام کر اپنے جسم کو محسوس کرتا ہے۔ چکھنے، محسوس کرنے اور تھامنے کے اس عمل سے وہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ اُس کی ذات کی حدود کیا ہیں۔ اگر اُس کی ماں اُسے اپنا جسم چھونے سے اس لئے نہیں روکتی کہ یہ نشوونما کا ایک معتدل اور طبعی حصہ ہے۔ تو بچہ غالباً اپنے جسم کے متعلق ایک صحت مندانہ تصور قائم کرنے میں کامیاب رہے گا۔ لیکن اگر اُسے اپنا جسم چھونے سے ہمیشہ روکا گیا، بُرا بھلا کہا گیا، یا والدین نے غضبناک ہو کر خفگی کا اظہار کیا تو اپنے جسم کے متعلق اُس کا مشاہدہ ضرور مسخ شدہ اور غیر صحت مندانہ ہو کر رہ جائے گا۔

اسی قسم کے تجربات اور تعلقات کی بنا پر بچہ اپنے ماحول اور خود اپنی ذات کی حقیقت سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ یہ اُس کی صحت مندانہ نشوونما کے لئے بے حد ضروری ہے، بلکہ ان کے ذریعے وہ دنیا کے دوسرے معاملات سے بھی روشناس ہو جاتا ہے۔ ابتدائی تجربات کا اثر بعد کے تجربات پر پڑتا ہے۔ بچہ اپنے گردوپیش کی چیزوں کی اہمیت کو اپنے پہلے تجربات کے ذریعے سمجھتا اور اُن سے مناسب سلوک کرتا ہے۔ مثلاً لفظ ''اماں'' کا مفہوم اُس کی نگاہوں میں ''پیار کرنے والی''، ''نرمی سے بولنے والی'' اور ''کھانا کھلانے والی ہستی'' پر مشتمل ہوتا ہے۔ پیار اور محبت کے اس مجسمے سے گہرا رشتہ قائم کر کے اُسے چاہت اور تحفظ کا بے پایاں احساس ہوتا ہے جو کہ اُس کی آئندہ زندگی کے توازن کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

بول چال کی ابتداء

چھوٹا بچہ اپنی دنیا کی گہرائیوں کو دو طرح سے سمجھتا ہے: ایک اس طرح کہ دنیا اُس پر کیا اثر ڈالتی ہے اور دوسرے وہ دنیا میں کیا کیا کر سکتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو وہ بول چال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بچہ اُس وقت بولنا شروع کرتا ہے جبکہ اُس کے اعضاء اور اعصابی نظام میں پختگی آ جائے اور اُسے اپنے ماحول سے خاصی واقفیت ہو جائے۔ بچہ اپنی تکلیف اور ناپسندیدگی کا اظہار پہلے سیکھتا ہے اور خوشی اور اطمینان کا اظہار بعد میں۔ لیکن ایک سال کی عمر تک بچہ اپنے احساسات کا اظہار آواز اور افعال کے ذریعے کرتا ہے۔ پہلے سال

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

کے اختتام تک وہ چھوٹے چھوٹے الفاظ بولنا سیکھ جاتا ہے۔ اور یہیں سے اصل زبان کا آغاز ہوتا ہے۔ زبان کی ترقی کا انحصار بہت حد تک گھر کے لوگوں کے باہمی تعلقات پر ہے۔ الفاظ کا صحیح مفہوم اُن کو بار بار بولنے سے سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ جب بچہ اپنے گردوپیش کے حالات کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ چند مستقل قسم کی چیزوں اور مانوس انسانوں کے لئے ایک خاص جگہ معین کر لیتا ہے۔ بول چال میں مہارت حاصل کرنے کے بعد وہ چیزوں کی مقامی اور ضمنی اہمیت کو اچھی طرح سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ مستقبل کے لئے منصوبے بناتا ہے اور گزرے ہوئے حالات کو یاد رکھتا ہے۔

عمر کے تقریباً دوڈھائی سال پہلے بچے کو الفاظ کے لغوی معنے نہیں آتے۔ الفاظ اُس کے لئے چند ایسے اشارے ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ افعال اور احساسات کو پہچان سکے۔ جو لفظ وہ استعمال کرتا ہے۔ وہ اُن جذبات کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں جن کے سلسلے میں اُس نے وہ الفاظ پہلی مرتبہ استعمال کئے یا سُنے ہوں۔ الفاظ استعمال کرنے سے اُسے اپنے وہی تجربات یاد آ جاتے ہیں اور اس کی آواز یا چہرے پر وہی اثرات نمودار ہو جاتے ہیں۔ لفظ ''بلی'' کہتے وقت بچہ مختلف قسم کے مطلب بیان کر سکتا ہے۔ جیسے کہ ''مجھے بلی سے خوف آتا ہے'' یا ''مجھے بلی پسند ہے'' یا ''میں بلی کو بلانا چاہتا ہوں۔'' کچھ عرصہ کے بعد اپنی ماں کی مدد سے وہ تصور اور خیالات کی دنیا کی حقیقت کو پہچاننے لگتا ہے۔ بہت سے الفاظ سیکھ لینے سے اُس کے اور والدین کے درمیان محبت کا رشتہ زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ جب وہ ''امی'' یا ''ابا'' کہتا ہے تو والدین پھولے نہیں سماتے اور اُن کو دیکھ کر بچہ بھی خوش ہو جاتا ہے اور بار بار ان الفاظ کو دہراتا ہے۔ بلکہ دوسرے الفاظ کو سیکھ کر بار بار دہرانے لگتا ہے کیونکہ وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس طرح نئے نئے الفاظ سیکھ کر وہ والدین پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔

خود کو اور دوسروں کو ایک سمجھنا (Identification)

بچے میں ایک اور اشتراکی عمل بھی ہوتا ہے جو اُسے دوسرے لوگوں سے اپنے تعلقات استوار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ننھا بچہ جھوٹ موٹ کے کھیلوں کے ذریعے خود کو کوئی دوسرا شخص تصور کرتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ذات کا کوئی مخصوص تصور قائم کرے، وہ اپنے آپ کو کئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے لوگوں کے روپ میں تصور کرتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی حرکات وسکنات کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور پھر اُن کی نقل کرتا ہے۔ کبھی وہ ''امی'' بنتا ہے کبھی ''ابا'' اور کبھی کوئی اور، اور پھر ان سے یگانگت محسوس کرتا ہے۔ اس طرح وہ مرد اور عورت کے جداگانہ رول کو سمجھنے لگتا ہے۔ خود کو ''ابا'' کہنے سے ایک بچہ بالکل ابا کا عکس نہیں بن جاتا۔ وہ خود کو کسی دوسرے روپ میں ڈھالتا ہے لیکن وہ کوئی دوسرا نہیں بن جاتا۔ ابھی وہ اپنی ہستی کو دوسروں سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ اُس کی دنیا میں سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو والدین کی ذات کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ اور کیا یہ سچ نہیں کہ والدین بھی اُسے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے ادھورے خوابوں کو اس کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور اُس کی کامیابیوں پر اس طرح فخر کرتے ہیں جیسے وہ خود انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہو۔ اس طرح بچہ اپنی خواہشات اور جذبات کو قبول کرنا نہیں سیکھتا۔ چونکہ وہ اپنے والدین کے رویے کو درست سمجھتا ہے اور چونکہ والدین کی خوشنودی پر اُس کی خواہشات کی تسکین کا انحصار ہے وہ خود اپنے احساسات کو جھٹلانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اپنے تجربات کی اُس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رہتی بلکہ وہ تمام حالات کو اپنے والدین کی نظروں سے پرکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچے کو دوسروں کے جذبات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو تا کہ اُس کی روشنی میں وہ اپنے جذبات کو بغیر کسی احساسِ جرم کے قبول کر سکے، خواہ وہ جذبات والدین کی خواہشات سے مختلف ہوں۔ اگر وہ اس اختلاف کا اظہار کرے تو بجائے اس کو بُرا بھلا کہنے کے اس کے لئے ایسے مواقع مہیا کیے جائیں جن میں وہ اپنی ''نامناسب'' خواہشات کا بھی بے ضرر طریقوں سے آزادانہ اظہار کر سکے۔

اگر بچے کی ابتدائی زندگی اطمینان بخش تجربات کا مجموعہ ہے تو وہ اپنے متعلق ایسا تصور قائم کرے گا جس میں موزونیت اور تحفظ کا ملا جلا احساس ہو گا۔ وہ یوں محسوس کرے گا جیسے اُسے والدین اور ہم جنسوں کا پیار اور بھروسا حاصل ہے۔ اس کے برخلاف اگر اُس کے تجربات کا پس منظر درشتی، ناموافقت اور سرد مہری سے بھرپور ہوا تو بچے کا تصور اُلجھا ہوا، مجادلانہ منفی قسم کا ہو گا۔ ایسے ناخوشگوار ماحول میں پلے ہوئے بچے، چلنا بولنا اور سمجھنا بہت دیر میں شروع کرتے ہیں۔ اُن کے نظریوں میں پختگی پیدا نہیں ہونے پاتی اور اُن کی حرکتیں تین چار سال کی عمر میں بھی طفلانہ رہتی ہیں۔ جس قسم کی شخصیت کی بنیاد ابتداء میں پڑ جاتی ہے اُس کا ارتقاء اُسی سمت میں ہونے لگتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیدائش کے وقت ایک بچے میں مختلف قسم کے انسان بننے کے امکانات ہوتے ہیں۔ تین سال کی عمر میں اُس کی شخصیت کی تکمیل کی سمت کا تعین ہو چکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کا ہر لحاظ سے بدلنا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت تک اُس کی شخصیت کی نشوونما ایک خاص رُخ اختیار کر چکتی ہے اور اس میں واضح تبدیلیاں پیدا کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

سکول سے پہلے

بچپن کے ابتدائی زمانہ میں ہر بچہ اپنی خاص رفتار سے نشوونما پاتا ہے۔ سکول جانے سے پہلے کی عمر میں اُس کے ارتقاء کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اُس کا جسم اب اتنی تیزی سے نہیں بڑھتا لیکن اس کی بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ماحول سے لین دین کا طریقہ سیکھ جاتا ہے۔ اس وقت بچے کے لئے مختلف قسم کے تجربات کے لئے مواقع مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے ذریعے وہ اپنے بڑھتے ہوئے فہم اور مہارت کو آزما سکے۔ یہ مہارت اُسے بالتدریج حاصل ہوتی ہے۔ شروع میں بچہ صرف مصروف رہنے کی خاطر کچھ کرتا ہے اور بعض دفعہ ایک ہی حرکت کو بار بار دہراتا ہے۔ وہ دن میں کئی بار سیڑھیاں اُترتا چڑھتا ہے۔ لکڑی کے ٹکڑوں کا مینار بناتا، گراتا اور پھر بناتا ہے۔ چار یا پانچ سال کی عمر میں وہ مختلف قسم کے کھیلوں کی اہمیت کو سمجھ کر اُس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ایک تین سال کا بچہ محض سیڑھیاں چڑھنے کے لئے سیڑھیاں چڑھتا ہے۔ پانچ سال کی عمر میں وہ ''اچھا لڑکا'' کہلانے کی خاطر سیڑھیاں چڑھتا ہے۔ اسی طرح لکڑی کے ٹکڑوں کا مینار بنانے سے وہ اپنی اعصابی قوتیں ہی نہیں آزماتا بلکہ اپنی سمجھ کو بھی استعمال کرتا ہے۔ وہ لکڑی کے ٹکڑوں کا قلعہ یا محل بنا کر اپنے تخیل کو فروغ دیتا ہے۔ تصویر کشی میں دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اُس کی ''تصویریں'' اب محض پنسل کی لکیریں نہیں ہوتیں بلکہ بامعنی نقش و نگار ہوتے ہیں جن میں وہ حقیقت کی عکاسی کی کوشش کرتا ہے۔ عمر کی اس منزل پر بچے کو حوصلہ افزائی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ طفولیت میں نفس کا احساس اعصابی نشوونما پر منحصر ہوتا ہے۔ عمر کے دوسرے سال کے آخر میں اعصابی اور ذہنی اختیار ایک دوسرے سے زیادہ متعلق نہیں ہوتے۔ اُس کی ذہنی صلاحیتیں حالات کے مطابق عمل کرنے کے لئے آزاد ہوتی ہیں۔ لیکن اب بچے کا اپنی ذات کے متعلق تصور زیادہ واضح نہیں ہوتا۔ بڑوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچے کی ذہنیت کو سمجھ کر اُس سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برتاؤ کریں اور اُس کی بساط سے بڑھ کر توقعات نہ رکھیں۔ اس طرح بچوں کی غلطیوں اور خطاؤں کو سمجھنا اور برداشت کرنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہم اُن کی بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ فکر نہیں رہتا کہ کہیں ہم نے بچوں کی غلط پرورش تو نہیں کی، یا کہیں ہمارے بچے میں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں جس کی وجہ سے وہ ایسی عجب حرکتیں کرتا رہتا ہے۔

وقت اور جگہ کی ماہیت کو سمجھنے کے بعد بچہ اپنے گردو پیش کی دنیا میں زیادہ سے زیادہ نظام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ماحول سے اپنی ذات کی علیحدگی کا احساس ہو جانے کے بعد وہ دنیا کی ہر چیز کو انفرادی نقطہ نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں لیکن یہ چیزیں اور یہ لوگ بچے کی زندگی پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں اور جہاں تک اُس کی ذات کا تعلق ہے وہ ان پر کیا اثر ڈال سکتا ہے؟ اس معاملے میں بچے کو وہ انسان بہت اہم نظر آتے ہیں جن کا اُس کی ابتدائی زندگی سے براہ راست تعلق رہا ہو۔ اُسے انسانوں کی اس دنیا میں دو قسم کے لوگ دکھائی دیتے ہیں: بڑے اور بچے۔ وہ دونوں سے متعلق ہوتا ہے بلکہ دونوں کا مرکز ہوتا ہے۔ پہلے وہ بڑوں کی دنیا کو پہچانتا ہے، پھر اپنی ذات کو اور آخر میں دوسرے بچوں کو۔ اُس کے شعور میں یہ تبدیلی دو اور ساڑھے تین سال کی عمر میں واقع ہوتی ہے۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں وہ چند بچوں سے دوستی کر لیتا ہے اور دوسروں کو اپنی صحبت سے خارج کر دیتا ہے۔ لیکن وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کہ وہ اُن کی انفرادی حیثیت کو سمجھتا ہے اور اُن کی خصوصیات کو پہچانتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اور والدین کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ انہیں تعلقات پر اُس کی خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔

لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی نظروں میں ماں کی اہمیت باپ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ ماں بچے کی پرورش میں باپ سے زیادہ نمایاں حصہ لیتی ہے۔ لیکن باپ کا کردار بھی بچے کی نظروں میں بڑی وقعت رکھتا ہے۔ دراصل خاندان کے سب افراد ایک دوسرے کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

بچوں کے نگہداشتی اداروں (Child Guidance Clinics) میں آنے والے بچوں کے مطالعے اور تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ بچوں کی غلط تربیت کے ذمہ دار ماں اور باپ دونوں ہوتے ہیں۔ چار پانچ سال کی عمر کے بچے مرد اور عورت کے جداگانہ کردار کو سمجھ کر اپنے لئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مناسب کردار کا انتخاب کر لیتے ہیں اور اُنہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے افعال مختلف ہوتے ہیں۔ ہر بچے کی دنیا میں کھیل بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ کھیل کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ ایک ڈھائی سال کا بچہ اکیلا کھیلنا پسند کرتا ہے۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں وہ دوسرے ہم عمر بچوں سے دوستانہ تعلق پیدا کرتا ہے۔ عام طور پر لڑکے لڑکوں کو دوست بناتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس عمر کی لڑکیاں بھی لڑکیوں ہی سے دوستی رکھنا پسند کریں۔

اس عمر میں بچے اب اپنے آپ کو اپنی دنیا کا مرکز نہیں سمجھتے بلکہ دوسرے بچوں کا حق پہچاننے لگتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک وہ بڑے گروہ میں نہیں کھیل سکتے۔ کیونکہ اس عمر کا بچہ من مانی کرنا چاہتا ہے جسے دوسرے بچے قبول نہیں کرتے۔ اس طرح بچہ سمجھ جاتا ہے کہ دوسرے بچے محض اُس کے لئے نہیں ہیں۔ ایک دوسرے کی یکتائی کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سکول جانے تک بچہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ ایک فرد ہے اور دوسرے بچے بھی افراد ہیں۔

زبان اور خیالات کا ارتقاء

سکول جانے سے دو سال پہلے بچے کے الفاظ کا خزانہ تیزی سے بڑھنے لگتا ہے۔ زبان دنیا کو سمجھنے اور اُس سے لین دین کرنے کا آلہ ہے۔ الفاظ کے محض جذباتی مفہوم سے نکل کر بچہ اب لغوی معنوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ الفاظ کے استعمال سے اُس کا تخیل پروان چڑھتا ہے اور وہ اپنے اور دوسرے لوگوں کے تجربات کو استعمال کرتا ہے۔ شروع شروع میں اُس نے جو چند الفاظ سیکھے تھے وہ سب کے سب ذاتی خواہشات اور جذبات کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اور وہ ان الفاظ سے عارضی طور پر اپنا مطلب نکال لیتا تھا۔ اب اس کا تجسس اس قدر بڑھ چکا ہے کہ وہ معلومات کی خاطر الفاظ استعمال کرتا ہے ''کیوں'' اور ''کیسے'' ایسے الفاظ ہیں جن کا جواب دیتے دیتے والدین تنگ آ جاتے ہیں۔ لیکن بچہ محض اُنہیں تنگ کرنے کی خاطر اُن سے سوال نہیں پوچھتا۔ بچے کے سوالات اُس کے تجسس یا کبھی کبھی پریشانی کو ظاہر کرتے ہیں۔ آگے چل کر یہی تجسس اُسے سائنس کی طرف لے جاتا ہے۔

خودی کی نشوونما

خودی کی نشوونما کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ مرد اور عورت کے رول کو اپنا سکے۔ سکول میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

داخل ہونے والا بچہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے ماں اور باپ کون ہیں۔

ابتدائی بچپن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ماں کا رول اپناتے ہیں۔ بعد میں لڑکا باپ کا کردار ادا کرنے لگتا ہے۔ لیکن باپ چونکہ وقت کا بیشتر حصہ گھر سے باہر گزارتا ہے اس لئے بچہ اُس کے مکمل کردار کو نہیں سمجھتا۔ لڑکیوں کو یہ فائدہ ہے کہ اُنہیں ماں کے نزدیک رہنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور وہ ماں کی عملی اور تفریحی زندگی میں برابر حصہ لیتی رہتی ہیں۔ بچے زندگی کے متعلق جو نظریہ دماغ میں بٹھا لیتے ہیں وہ اُن کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ نظریہ تاریک اور محدود ہو تو بچہ ایک متعصب اور بے مروت قسم کا انسان بنتا ہے۔ بچے کی خاطر ہمیں اپنے افعال میں بھی استقامت پیدا کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ بچے کو ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین کرتے رہیں اور خود عمداً جھوٹ بولا کریں۔ اس سے بچے کی نشوونما پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ بچے میں صحت مندانہ ذہنیت پیدا کرنے کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ یہ ہیں:

(1) ایک ایسی فضا جہاں بچے کو یہ احساس ہو کہ وہ مقبول ہے، اُس کی قدر ہے اور اُس سے محبت کی جاتی ہے۔

(2) ایک ایسی فضا جہاں چھان بین کرنے اور غلطیاں کر کے سیکھنے کے مواقع حاصل ہوں اور جہاں خطائیں اور غلطیاں ہو جانے کے بعد بھی ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے محبت اور تحفظ کا احساس ہو۔ ایسی فضا میں بچہ اپنی زندگی اطمینان اور خوشی کے ساتھ گزار سکے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماں باپ کی محبت

ڈاکٹر حمید الدین

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک بچے سے ماں باپ کو جو محبت ہوتی ہے وہ اس تعلق کا لازمی نتیجہ ہے جو ایک بچے اور اس کے ماں باپ کے درمیان قدرتی طور پر محض اس لئے پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ بچہ ہے اور وہ ماں باپ ہیں۔ چونکہ بچہ حیاتیاتی لحاظ سے والدین کے جسم کا ایک حصہ ہوتا ہے، بچے اور ماں باپ کے درمیان ایک ایسا رشتہ پیدائش سے بھی بہت پہلے استوار ہو جاتا ہے جو بچے اور والدین کی زندگی کی ایک ایسی اٹل حقیقت بن جاتا ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بچے سے ماں باپ کی محبت کے متعلق اس نظریئے کی تائید کے طور پر منجملہ اور امور کے اس پر اکثر زور دیا جاتا ہے کہ انسان تو انسان، حیوان بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت بالکل ویسی ہوتی ہے جیسی انسانوں کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے اور یہ محض اس لئے کہ حیاتیاتی طور پر ایک حیوانی بچہ اپنے ماں باپ کے جسم کا بعینہ اسی طرح ایک حصہ ہوتا ہے جیسے کہ ایک انسانی بچہ۔

ماں باپ خواہ انسان ہوں خواہ حیوان، انہیں اپنے بچے کے ساتھ محبت کرنا لازمی ہے۔ محض اس لئے کہ بچے کا جسم ماں باپ کے جسم سے بنتا ہے۔

سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو اس نظریے میں کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دیتی جس سے کسی کو بھی اختلاف ہو۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں تسلیم کرنا نفسیات کے ماہرین کے لئے ذرا مشکل ہے۔

مثلاً نفسیات کے ماہرین یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اس محبت میں جو حیوانی ماں باپ کو اپنے بچے سے ہوتی ہے اور اس محبت میں جو انسانی ماں باپ کو اپنے بچے سے ہوتی ہے، بالکل

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی فرق نہیں۔ ان سے پوچھیے تو وہ یہ کہیں گے کہ ان دونوں قسم کی محبتوں میں، باوجود اس مماثلت کے جس کی بنا پر عام لوگ انہیں ایک ہی چیز تصور کرتے ہیں، اس قدر فرق پایا جاتا ہے کہ جب تک ہم یہ نہیں سمجھ لیتے کہ یہ فرق کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ ہمارے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ایک ماں باپ بالخصوص ایک انسانی ماں باپ اپنے بچے سے کیوں محبت کرتے ہیں اور یہ محبت نہ ہو تو ادھر ماں باپ کی اور اُدھر بچے کی زندگی کیا سے کیا بن جاتی ہے۔

انسانی اور حیوانی ماں باپ کی محبتوں میں جو فرق ہے اسے بیان کرتے وقت سب سے زیادہ زور دو باتوں پر دیا جاتا ہے: ایک یہ کہ جہاں انسانی ماں باپ کی محبت صحیح معنوں میں ماں اور باپ دونوں کی محبت کا ایک مرکب ہوتی ہے، وہاں حیوانی ماں باپ کی محبت دراصل صرف ماں کی محبت ہی ہوتی ہے۔ باپ کی محبت یونہی برائے نام سی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ جہاں انسانی ماں باپ اپنے بچے سے محبت کرتے ہیں تو عمر بھر کے لئے کرتے ہیں، وہاں حیوان اپنے بچے سے صرف اس عمر تک محبت کرتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی خوراک مہیا کرنے اور اپنے آپ کو دوسرے خطرات سے بچانے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

بجائے اس بحث میں اُلجھنے کے کہ ان دونوں باتوں کو ہمیں سو فی صدی درست مان لینا چاہئے یا نہیں، یہ بہتر ہوگا کہ ہم کچھ ان امور پر غور کریں جنہیں ماہرینِ نفسیات معنی خیز اور اہم تصور کرتے ہیں۔

مثلاً یہ سیدھی سی حساب کی بات ہے کہ جہاں تک ماں باپ کی محبت کا تعلق ہے۔ انسانی بچہ حیوانی بچے کے مقابلے میں دوگنا فائدے میں رہتا ہے۔ حیوانی بچے کو صرف ایک ماں کی محبت میسر آتی ہے۔ انسانی بچے کو ایک ماں کی اور دوسری باپ کی محبت ملتی ہے۔

یہی نہیں، انسانی بچہ حیوانی بچے کے مقابلے میں ایک اور طرح بھی نفع میں رہتا ہے۔ جن لوگوں نے محبتِ مادری اور شفقتِ پدری کا تجزیہ کیا ہے، اگر ان کی بات تسلیم کر لی جائے تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ باوجود اس تمام مماثلت کے جو ان دونوں میں پائی جاتی ہے اور جس کی بنا پر اکثر انہیں ایک ہی چیز تصور کر لیا جاتا ہے، ماں کی محبت ماں کی محبت ہوتی ہے اور باپ کی محبت باپ کی، اور یہ درست ہے تو صاف ظاہر ہے کہ انسانی بچے کو ماں باپ کی طرف سے جو محبت کی دولت عطا ہوتی ہے، وہ اس دولت سے جو حیوانی بچے کو عطا ہوتی ہے صرف دوگنی ہی نہیں ہوتی بلکہ زیادہ متنوع بھی ہوتی ہے۔

محبت مادری اور شفقتِ پدری کے باہمی فرق کی سند ماں اور باپ کے درمیان وہ تمام

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اختلافات ہیں جو تقریباً ہر گھر میں نظر آتے ہیں اور جن کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ماں کو بچے سے محبت ہے اور باپ کو نہیں، یا ایک کو بچے سے زیادہ محبت ہے اور دوسرے کو کم، بلکہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ماں اور باپ دونوں کو بچہ یکساں عزیز ہوتا ہے۔

رہا یہ امر کہ انسانی ماں باپ بچے کو عمر بھر کے لئے چاہتے ہیں اور حیوانی ماں صرف اس وقت تک جب تک کہ بچہ اپنی خوراک مہیا کرنے کے قابل نہیں ہو جاتا، اور اپنے آپ کو دیگر خطرات سے بچانے کی اس میں طاقت نہیں آجاتی، تو اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے سایکالوجی کے ماہرین نے جن باتوں پر زور دیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جن خطرات سے حیوانی بچے کو بڑے ہو کر واسطہ پڑتا ہے ان تمام کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ اگر حیوان تندرست اور توانا ہے تو وہ ان سے بخوبی نپٹ لیتا ہے۔ علاوہ تندرستی اور توانائی کے اسے ان خطرات کا سامنا کرنے کے لئے اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ذہانت ہوتی ہے جو اسے قدرت عطا کرتی ہے۔ چونکہ حیوانی ماں باپ کی محبت نہ اس تندرستی اور توانائی میں کچھ اضافے کا باعث بن سکتی ہے نہ اس ذہانت میں۔ حیوانی بچے کے لئے قدرت نے اس کا انتظام بھی نہیں کیا۔ مگر اس کے برعکس انسانی بچے کو بڑے ہو کر جن مسائل اور خطرات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ محض توانائی اور تندرستی اور فطرتی ذہانت کے بل بوتے پر ان سے نہیں نپٹا جا سکتا۔ انسان کو جسمانی طاقت اور فطری ذہانت کے علاوہ ان خطرات سے نپٹنے کے لئے کچھ اور سہارے بھی درکار ہوتے ہیں۔ یہ سہارے نہ ہوں تو باوجود جسمانی طاقت و توانائی کے اور باوجود اعلیٰ فطرتی ذہانت کے وہ اپنے آپ کو اپاہج سا محسوس کرتا ہے۔ ماں باپ کی محبت ان تمام سہاروں کی جڑ ہوتی ہے۔ چنانچہ قدرت نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ انسانی بچے کو ایسے خطرات سے نپٹنے کے لئے ماں باپ کی محبت ساری عمر ملتی رہے۔

آپ کہیں گے قدرت ایک اچھی خاصی دانا و بینا ہستی معلوم ہوتی ہے۔ جو ایک مشفق سفید ریش بزرگ کی طرح ہر وقت بیٹھی یہی سوچتی رہتی ہے کہ فلاں بچے کے لئے کیا مفید ہے؟ اور فلاں کے لئے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کا جواب مختصراً یہ ہے کہ قدرت سے مراد یہاں وہ فطرتی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے ہر زندہ شے وہ صفتیں پیدا کر لیتی ہے جو اس کی بقاء اور اس کی مفید ترین طرز زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہیں، اور ان خصائل سے چھٹکارا پا لیتی ہے جو اس کی بقاء کے منافی ہوتے ہیں۔ مفید

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صفات کی تحصیل اور مخرب خصائل کے ازالے کے لئے اکثر و بیشتر صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ مگر ایسا بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے کہ ایک ہی فرد کی زندگی میں ان عظیم الشان تغیرات کی داغ بیل پڑ جائے۔

یہ نکتہ مدِّ نظر رکھا جائے تو اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حیوانی زندگی کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر بچے کو ماں باپ کی طرف سے اس وقت تک ہی محبت ملتی رہے جب تک کہ وہ خوراک فراہم کرنے اور اپنے آپ کو دیگر خطرات سے بچانے کے قابل نہیں بن جاتا تو بس ٹھیک ہے۔ مگر اس کے برخلاف انسانی زندگی کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں کہ بچے کو ماں باپ کی محبت کا وافر حصہ حیوانی بچے سے زیادہ نہ ملے تو وہ اپنی زندگی کامیابی سے بسر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انسانی بچے کو ایک ماں ہی نہیں باپ بھی محبت کی دولت عطا کرتا ہے اور چند دنوں یا ہفتوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عمر بھر کے لئے۔

علاوہ اس بے بہا محبت کے خزانے کے جو انسانی بچے کو ماں باپ سے ملتا ہے، اسے ایک اور محبت کا خزانہ بھی اکثر ہاتھ آتا ہے اور وہ ہوتا ہے بہن بھائیوں کی محبت کا خزانہ۔ حیوانی بچہ بہن بھائیوں کی محبت کے اس خزانے سے زیادہ تر محروم ہی رہتا ہے۔ چونکہ اس مضمون کا تعلق محض ماں باپ کی محبت سے ہے، ہم بہن بھائیوں کی محبت کے خزانے سے بحث نہیں کریں گے۔

(2)

جو نظریہ اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسانی بچے کو حیوانی بچے کے مقابلے میں محبت کی غذا دوگنی تگنی اور بہت زیادہ متنوع قسم کی ملتی ہے۔ اس لئے بڑا ہو کر وہ حیوانی بچے کے مقابلے میں کئی اعتبار سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہر جاندار، خواہ وہ حیوان ہو یا انسان، بڑا ہو کر زندگی میں سرخروئی اور کامیابی محض اس غذا کے بل بوتے پر ہی حاصل کرتا ہے۔ یا اگر اس کی زندگی کی ساری کامیابی محض اس غذا کی مرہونِ منت نہیں تو پھر اس غذا کے علاوہ اور کون سے عناصر ہیں جن پر اس زندگی کی کامیابی کا دارومدار ہے اور ان عناصر میں غذا کو کیا مقام حاصل ہے؟

جہاں تک سائیکالوجی کا تعلق ہے وہ اس سوال کا صرف اس حد تک جواب دے سکتی ہے جس حد تک کہ یہ غذا ماں باپ یا بہن بھائیوں کی محبت کی غذا کی شکل میں بچے کو ملتی ہے مگر یہ کہ ماں

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے دودھ کے علاوہ انسانی اور حیوانی بچوں کو جو مادی غذا ملتی ہے اس کا ان کی زندگی پر بعد میں کیا اثر پڑتا ہے۔ بایولاجیکل اور کیمیکل سائنسوں کے ماہرین ہی ہمیں بتا سکتے ہیں۔ ہم ان ماہرین سے صرف استدعا کر سکتے ہیں کہ وہ تجزیاتی تجربات کا ایک سلسلہ شروع کریں۔ جن سے ہم اس بارے میں غیر مبہم نتائج پر پہنچ سکیں۔

(3)

انسان اس لئے اشرف المخلوقات کہلاتا ہے کہ یہ اس وقت وجود میں آیا جب قدرت تمام مخلوقات کو وجود میں لا چکی تھی۔ چنانچہ انسان کی تخلیق میں قدرت نے جو جو کمالات دکھائے ہیں ان سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کی تمام مخلوقات کو قدرت نے محض اس لئے بنانا شروع کیا تھا کہ بالآخر اسے انسان جیسی عظیم الشان مخلوق بھی بنانی تھی۔ انسان کو نہ بنانا مقصود ہوتا تو شاید قدرت دوسری مخلوقات کی تخلیق کی زحمت ہی گوارا نہ کرتی۔

اب منجملہ دوسرے سوالات کے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ قدرت کو اتنی اعلیٰ ہستی پیدا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اور اس کے جواب میں جہاں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ وہاں یہ ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اس کارخانہء قدرت میں جہاں دوسری مخلوقات، ایک یا دو یا صرف معدودے چند فضائل کی حامل ہیں، وہاں انسان میں تمام کے تمام وہ فضائل پائے جاتے ہیں جو ان تمام مخلوقات میں مجموعی طور پر پائے جاتے ہیں۔ یعنی انسان خلاصہء حیات ہے اور اگر انسان وجود میں نہ آتا تو یوں تھا جیسے قدرت کا تخلیقی پروگرام ادھورا رہ جاتا۔ اس فنکار کے کاروبار کی طرح جو عمر بھر عامیانہ فن پارے تو بناتا رہتا ہے لیکن ایک بھی ایسا شاہکار نہیں بنا سکتا جو اس کی تمام تر تخلیقی قوتوں کا مظہر مانا جائے۔

اسی سوال کا جواب یوں بھی دیا جا سکتا ہے کہ اس کارخانہء قدرت کے تمام تر کمالات و عجائبات کو بروئے کار لانے کے لئے ایک ایسی مخلوق کی ضرورت تھی جس کے اندر وہ تمام فضائل جمع کر دیئے جائیں جو دیگر تمام مخلوقات میں علیحدہ علیحدہ ودیعت کئے گئے ہیں۔

اس جواب کی تائید کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ دیگر مخلوقات کی زندگی کے عمیق ترین مطالعے کے بعد بھی ہم ایسا کوئی کام نہیں بتا سکتے جو انسان ان مخلوقات سے بہتر طور پر سرانجام نہ دے سکتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو۔ برخلاف اس کے انسان سینکڑوں ایسے کام کرنے کا اہل ہے جو دیگر مخلوقات میں سے کوئی بھی اس خوبی کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکتی جیسے کہ انسان۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کی یہ بے مثال برتری صرف اس بات کی مرہون ہے کہ جہاں دیگر مخلوقات میں مختلف فضائل علیحدہ علیحدہ پائے جاتے ہیں، انسان میں ان تمام فضائل کو ایک ہی ہستی کے وجود میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ یہ بات کہ انسان کی یہ ساری برتری محض ان فضائل کو ایک ہی ہستی کے وجود میں اکٹھا کر دینے کا نتیجہ ہے، ہمیں اس مثال سے بآسانی سمجھ آسکتی ہے جو آرٹ کے چند مسائل کی تشریح کی خاطر دی جاتی ہے، اور جس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ آرٹ کا بڑے سے بڑا شاہکار اپنی عظمت کے اعتبار سے ان مختلف اجزاء کا مرہون ہوتا ہے جو عام طور پر دیگر فن پاروں میں علیحدہ علیحدہ یا ایک ایک دو دو کر کے تو پائے جاتے ہیں لیکن جنہیں شاذ و نادر ہی کوئی فنکار صرف ایک شاہکار میں جمع کر پاتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسانی برتری اُن اَن گنت فضائل کو جو دیگر مخلوقات میں علیحدہ علیحدہ پائے جاتے ہیں، اکٹھا کر دینے پر مبنی ہے۔ اس لئے قدرت کو انسانی وجود میں ان فضائل کی شیرازہ بندی کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑا ہوگا اور یہ کچھ حد تک ہے بھی درست۔ البتہ تفصیل سے یہ کہنا کہ قدرت نے اس شیرازہ بندی کے لئے کیا کچھ کیا ہے، مشکل ہے۔ ہم صرف قدرت کے ان انتظامات میں سے ایک آدھ کا ہی ذکر کر سکتے ہیں۔

(4)

انسان اور حیوان میں اب تک جو فرق گنوائے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

1- حیوان معدودے چند فضائل کا حامل ہوتا ہے لیکن انسان ان تمام فضائل کا حامل ہوتا ہے جو دیگر مخلوقات کو علیحدہ علیحدہ کیے جاتے ہیں۔

2- ایک حیوان کا کاروبارِ زندگی اتنا آسان ہوتا ہے کہ جن ایک دو فضائل کا یہ حیوان حامل ہوتا ہے وہی اس کاروبار کی تکمیل کے لئے کافی ہوتے ہیں، اور چونکہ یہ فضائل تعداد میں تھوڑے سے ہی ہوتے ہیں ان کی شیرازہ بندی بھی آسان ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کا کاروبارِ زندگی اتنا اہم اور کٹھن ہوتا ہے کہ جب تک اِسے گوناگوں فضائل نہ عطا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیے جائیں اس کاروبار کی تکمیل ناممکن ہوتی ہے۔ مگر ان گونا گوں فضائل کا وجود ہی محض کافی نہیں ان کی شیرازہ بندی نہایت اہم ہوتی ہے، اور یہ شیرازہ بندی اتنی آسان نہیں ہوتی جتنی کہ حیوانات کے معدودے چند فضائل کی شیرازہ بندی آسان ہوتی ہے، بلکہ یہ نہایت ہی دشوار کام ہے اور قدرت کو اس کے لئے خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

3- حیوانی بچے کو اگر ماں باپ کی محبت کا ایک حصہ عطا کیا جاتا ہے تو اس کے مقابلے میں انسانی بچے کو ماں باپ کی محبت کے سو بلکہ ہزار سے بھی زیادہ حصے عطا کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا نکات بالخصوص نکات (2) اور (3) کے مابین جو منطقی تعلق ہے، اسے سامنے رکھا جائے تو یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے گونا گوں فضائل کی شیرازہ بندی کا اس محبت کی غذا کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جو اسے بچپن ہی سے ماں باپ کی محبت کے ساتھ ملنا شروع ہو جاتی ہے اور عمر بھر ملتی رہتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر قدرت انسانی بچے کے لئے یہ انتظام نہ کرتی کہ اسے حیوانی بچے کے مقابلے میں ماں باپ کی محبت کا اس قدر وافر حصہ ملے تو انسان کبھی "فخرِ کائنات" ہونے کا وہ مقام حاصل نہ کرتا جس پر ہم سب کو اس قدر ناز ہے۔

بظاہر یہ دعویٰ تسلیم کرنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔ ماں باپ کی محبت کا بھلا انسانی فضائل و کردار کی شیرازہ بندی سے کیا تعلق؟ وہ ایک معصوم سی سیدھی سادی سی مفت کی ملی ہوئی چیز، ایک فلسفیانہ، معقولاتی محنت و کدوکاوش سے حاصل کردہ چیز، ان دونوں میں دُور کا تعلق بھی نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن سائیکالوجی والوں سے پوچھیے تو وہ کہیں گے کہ عقلی دلائل سے اور فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کے ذریعے شاید ہم یہ ثابت نہ کرسکیں کہ ان میں بہت گہرا تعلق ہے۔ مگر ہمارا رات دن کا تجربہ یہی کہتا ہے کہ ماں باپ کی محبت صحیح معنوں میں جڑ ہے تمام انسانی فضائل و کردار کی، اس شیرازہ بندی کی، جس کے بغیر انسان انسان نہیں رہتا بلکہ حیوان بن جاتا ہے۔

جہاں تک سائیکالوجی والوں کے اس تجربے کا تعلق ہے، اس کی نوعیت اور حیثیت معلوم کرنے کے لئے آپ کو ان ہزاروں بلکہ لاکھوں مریضوں کے حالات پڑھنے ہوں گے جن کا علاج سائیکالوجی والوں نے گزشتہ قریباً پچاس سال کے عرصے میں کیا ہے۔ یہ لاکھوں کیس اس ایک امر کے شاہد ہیں کہ وہ مرض جس میں وہ لوگ جنہیں عرفِ عام میں، پگلا اور دیوانہ کہا جاتا ہے، پھنس جاتے ہیں اس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ شخص جسے ماں باپ کی محبت کی غذا صحیح مقدار میں اور صحیح

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تناسب کے ساتھ مل جاتی ہے، کبھی ان کا مریض نہیں بن سکتا اور وہ شخص جسے ماں باپ کی محبت کی غذا صحیح مقدار میں اور صحیح تناسب کے ساتھ نہیں ملتی، کبھی ان سے بچ نہیں سکتا۔

دماغی مرض کی قسم خواہ کوئی بھی ہو بظاہر اس کا تعلق مریض کے جنسی رجحانات سے ہو، احساس کمتری سے ہو، توہمات ووساوس سے ہو، ہم چوں ما دیگرے نیست کے زعم سے ہو، یہ مرض دراصل ہوتا اس وقت ہے جب کہ مریض میں حقیقت بینی کی اہلیت نہیں رہتی اور وہ حقائق زندگی کو اس طرح خلط ملط کر جاتا ہے اور انہیں اس طرح اُلٹ پلٹ کر کے دیکھتا ہے کہ اسے قدم قدم پر ٹھوکریں ہی نہیں، صدمے اٹھانے پڑتے ہیں اور ان صدموں کی وجہ سے اس کی قوت برداشت دن بدن بلکہ لحظہ بہ لحظہ کم ہونا شروع ہو جاتی ہے تا آنکہ وہ کولیپس (Collapse) کر جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو، اور کارزارِ حیات میں نبرد آزمائی کر سکے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ماں باپ کی محبت کا تعلق انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں سے ہے۔ اس پہلو سے بھی کہ انسان اپنے ماحول سے نپٹتے وقت کس حد تک حقیقت بینی سے کام لیتا ہے؟ اور کہاں تک کج بینی اور بد بینی کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے؟ اور اس پہلو سے بھی کہ انسان زندگی کی ٹھوکروں اور زندگی کے صدموں کی کہاں تک تاب لا سکتا ہے؟ اور ان صدمات سے نپٹنے کے لئے اس کی قوت برداشت کس حد تک اس کا ساتھ دیتی ہے؟

ایک بڑی عمر کے انسان کی حقیقت بینی، حقیقت بینی کی ان عادات کا نتیجہ ہوتی ہے جو اکثر بچپن ہی میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ ایک بچہ اپنی زندگی کے لیل ونہار کی ابتداء جس دنیا میں کرتا ہے وہ نہایت مختصر سی دنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ واسطہ اس کا اپنی ماں، اپنی دایہ، اپنے باپ اور اپنے بھائی بہنوں سے پڑتا ہے۔ چند ہی دنوں میں یہ ننھا منا سا بچہ جسے ہم اکثر بے سمجھ جانتے ہیں، اس دنیا کے ممتاز ترین شہریوں کی پرکھ کر لیتا ہے اور اسے اس کی اچھی طرح سمجھ آ جاتی ہے کہ اس کی ماں کون ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ اس دنیا کے ان شہریوں کے مابین تمیز کرنا حقیقت بینی کی سب سے پہلی کڑی ہوتا ہے۔ بچے کا اس دنیا، ان شہریوں کے ساتھ ساتھ اس دنیا کے مادی عناصر کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ جوں جوں اسے ماں باپ وغیرہ میں تمیز کرنا آتا جاتا ہے وہ اپنے مادی ماحول کے دیگر عناصر میں تمیز کرنا بھی سیکھتا جاتا ہے۔

بالفرض محال اگر ایک بچہ اس چھوٹی سی دُنیا کے ان شہریوں میں تمیز کرنا نہ سیکھ پائے اور اسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس دُنیا کے دیگر عناصر میں تمیز کرنا بھی نہ آئے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کی زندگی کی حرکات وسکنات پراگندہ اور لایعنی سی رہ جاتی ہیں۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک ننھے سے بچے کی طرف یہ سادہ سی حقیقت بینی منسوب کرنا بھی زیادتی ہے، کیونکہ بچہ تو بالکل ایک معصوم سی ہستی ہوتا ہے اور ان تمام امتیازات کے لئے ایک اعلیٰ قسم کی قوتِ استدلال وغیرہ درکار ہوتی ہے، انہیں چاہئے کہ کسی ایک بچے کی زندگی کا بغور مطالعہ کریں۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ باور کرلیں گے کہ بچہ خواہ کتنا ہی ننھا منا سا کیوں نہ ہو اِس کی زندگی میں ایک خاص قسم کا تناسب اور ایک خاص قسم کا آہنگ پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ آہنگ اور تناسب ان تمام امتیازات کا نچوڑ ہوتا ہے جو ایک بچہ اس ننھی سی عمر میں ہی سیکھ جاتا ہے، اور یہ اسی آہنگ کا نتیجہ ہے کہ بچے کی دنیا کے دیگر شہری وقتاً فوقتاً اس کے مطالبات اور اس کی ضروریات سمجھ جاتے ہیں اور جو صحیح معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں۔ ہم بڑی عمر کے لوگوں کا بچے کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کے ساتھ ایک مفید اور معنی خیز رشتہ استوار کرنا ناممکن بن جائے۔ اگر ہم بچے کی زندگی میں جو آہنگ ہے اسے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر سمجھ نہ جائیں اور اس کے مطابق اپنے رویے کو بچے کی ضروریات کے مطابق ڈھال نہ لیں۔

اگر حالات درست رہیں اور بچے کے ماں باپ وغیرہ بچے کی زندگی کے اس آہنگ کے مطابق اس کے ساتھ برتاؤ کریں تو بچے کی زندگی ایک خاص لذت وسرور سے بھرپور رہتی ہے۔ اسے ماں ماں اور باپ باپ ہی نظر آتا رہتا ہے اور عمر بھر کے لئے اس کی حقیقت بینی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

مگر حالات مساعد نہ ہوں تو نہ ماں نہ باپ اور نہ دوسرا کوئی بچے کی زندگی کا آہنگ سمجھنے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کی نگاہ میں اس کی ماں محض ماں نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ بھی وہ اور بہت کچھ بن جاتی ہے اور اس کی نگاہ میں اس کا باپ باپ نہیں رہتا بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ اور بہت کچھ بن جاتا ہے۔ جونہی ماں میں غیر ماں کی صفتیں پیدا ہونا شروع ہوئیں اور باپ میں غیر باپ کی صفتیں نظر آنے لگیں، بچہ گھبراہٹ اور پریشانی میں الجھنے لگ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی چھوٹی سی دُنیا میں جسے وہ ایک خاص زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے کا عادی تھا، بہت سے اور زاویے پیدا ہو جاتے ہیں اور صفائی اور سادگی کی بجائے اس کی نگاہ میں الجھاؤ اور پراگندگی آجاتی ہے۔ یہ الجھاؤ اور پراگندگی بچپن ہی میں ایک بار راسخ ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائے تو بڑے ہو کر کج بینی سے بچنا اور حقیقت بینی کو شعار بنانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

آپ غبی سے غبی ماں باپ سے پوچھیے وہ کبھی یہ نہیں مانیں گے کہ انہوں نے ارادتاً بچے کی زندگی کے آہنگ کو نظر انداز کیا تھا اور یہ ہے بھی درست۔ کوئی ماں باپ بچے جیسی نعمت سے جان بوجھ کر منہ نہیں موڑتے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہم میں سے اکثر کو اپنے روز و شب پر پورا قابو نہیں۔ کشمکش روزگار میں رات دن اُلجھے ہوئے ماں باپ کو بچے کی زندگی کے آہنگ کو ہر وقت ملحوظِ خاطر رکھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور یہ ان دشواریوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اکثر ماں باپ وہ سعی و کوشش زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھتے جو انہیں بچے کی ضروریات کو ہمیشہ سمجھ بوجھ کر ان کا تدارک کرنے کے لئے لازمی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کی نگاہ میں یہ غفلت مجبوری کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، ایک معمولی سی چیز ہے۔ مگر بچے کی عمر بھر کے لئے نگاہ اس قدر کج ہو جاتی ہے کہ اکثر بڑے ہو کر اسے اس کج بینی کی بدولت بہت سے مصائب جھیلنا پڑتے ہیں۔

ایک عام وجہ ماں باپ کی ایک بچے کے ساتھ ہم آہنگی کھو بیٹھنے کی یہ ہوتی ہے کہ اس بچے کے بعد ایک دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے اور یہ دوسرا بچہ پہلے کی بجائے ان کی تمام تر توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں پہلے بچے پر جو کچھ گزرتی ہے۔ اسے کچھ وہی جانتا ہے۔

اس ایک وجہ کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں جن کی بنا پر ماں باپ ایک بچے کی طرف سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر بجائے ان دیگر وجوہات کا ذکر کرنے کے اب یہ بہتر ہو گا کہ ہم ماں باپ کی محبت کا ایک انسان کی زندگی کی ٹھوکریں اور صدمے اُٹھانے کی قوت برداشت کے ساتھ جو تعلق ہے اس پر تھوڑا سا غور کریں۔

آپ کسی بھی ڈاکٹر سے پوچھ لیں، صحت اور تندرستی کا معیار یہ ہے کہ جسم میں بیماری کے جراثیم کے خلاف جنگ کرنے کی اتنی طاقت ہو کہ جب بھی کسی وجہ سے ایسے جراثیم جسم میں داخل ہوں، جسم ان کے خلاف جنگ کر کے انہیں بالکل ختم کر دے یا کم از کم اتنا کمزور کر دے کہ وہ جسمانی اعضاء کے عمل میں حارج نہ ہوں۔

اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دماغی صحت کا معیار یہ ہے کہ انسان کی شخصیت میں اتنی طاقت ہو کہ جہاں کہیں اسے کوئی ٹھوکر لگے یا صدمہ پہنچے وہ اس کے تخریب کن اثرات کے ساتھ جنگ کر کے یا تو انہیں بالکل ختم کر دے یا اس حد تک بے ضرر بنا دے کہ دماغی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قواء اپنے عمل میں جوں کے توں لگے رہیں۔

جہاں تک دماغی صحت کا تعلق ہے زندگی کی ٹھوکریں اور صدمے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو جسمانی صحت کے سلسلے میں بیماریوں کے جراثیم کو حاصل ہے، اور ٹھوکریں اور صدمے برداشت کرنے کی طاقت کی وہی حیثیت ہے جو جسم کی اس طاقت کی ہے جو جراثیم کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہے۔

جس طرح جسمانی بیماریوں کے جراثیم ہر وقت ہمارے جسم پر حملہ آور رہتے ہیں بعینہ اسی طرح زندگی کی ٹھوکریں اور صدمے انسانی شخصیت پر یلغار کرتے نظر آتے ہیں۔ خواہ یہ شخصیت کسی امیر آدمی کی ہو خواہ کسی غریب کی۔

جسمانی اور دماغی صحت میں جو مشابہت ہے وہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ ایک مشابہتی نکتہ ابھی باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ جسم میں جراثیم کے خلاف جنگ کرنے کی طاقت اس غذا کی مرہونِ منت ہوتی ہے جو اس جسم کو رات دن ملتی ہے۔ یہ غذا کم کر دی جائے اس میں زہریلے مادّے شامل کر دیئے جائیں یا اس کا سلسلہ بالکل ختم کر دیا جائے تو جسم میں جراثیم کے خلاف جنگ کرنے کی طاقت بھی اسی تناسب سے ختم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک شخصیت میں ٹھوکروں اور صدموں کے تخریب کن اثرات زائل کرنے کی طاقت بھی دراصل غذا ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ صرف یہ غذا سو فی صدی وہی غذا نہیں ہوتی جو جسم کی طاقت قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے۔ گو اس کا بھی بہت سا ہاتھ اس میں ہوتا ہے بلکہ یہ غذا وہ محبت ہوتی ہے جو ایک انسان کو اپنے ماں باپ کی طرف سے ملتی ہے۔ ایک اس حالت میں جب کہ یہی انسان ابھی بچہ تھا اور ایک اس حالت میں جب یہ بڑا ہوا اور میدانِ عمل میں لنگر لنگوٹ کس کے اُتر آیا۔ جس انسان کو بچپن میں ماں باپ کی محبت کی پوری غذا ملتی رہتی ہے وہ بڑا ہو کر اپنی شخصیت میں بعض دفعہ اس حد تک ٹھوکریں اور صدمے برداشت کرنے کی طاقت پاتا ہے کہ وہ خود حیران رہ جاتا ہے اور جس انسان کو بڑے ہو کر بھی یہ محبت کی غذا ملتی رہتی ہے وہ بہر حال اس انسان سے ٹھوکریں اور صدمے برداشت کرنے کی طاقت اپنے آپ میں زیادہ پاتا ہے جس کو یہ غذا بڑی عمر میں بالکل نہیں ملتی۔

مگر بڑی عمر میں ماں باپ کی محبت باوجود کارآمد اور مفید ہونے کے اس حد تک فائدہ مند نہیں ہوتی جس حد تک کہ بچپن میں ملی ہوئی محبت ہوتی ہے۔ بچپن میں ملی ہوئی محبت کی اس غذا کا یہ کمال ہے کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود اس کی یاد زندگی کا ایک مضبوط ترین سہارا بنی رہتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے اور ہر آڑے وقت میں انسان کے کام آتی ہے۔

ماں باپ کی محبت میں یہ جادو کا اثر کہاں سے آتا ہے؟ اس کا پورا جواب تو نہیں لیکن ادھورا سا جواب یہ ہے کہ جس بچے کو اس کے ماں باپ ہی محبت نہیں کرتے اس کے لئے یہ یقین کرنا کہ اس میں کوئی بھی بات ایسی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کوئی اس سے محبت کرے قریباً ناممکن ہے اور جو اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کوئی اس سے محبت کرے وہ اپنی نگاہوں میں خود اس قدر ذلیل ہوتا ہے کہ اسے زندہ رہنے کے لئے بھی بہانے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔

اس ادھورے جواب کی ایک اور شکل بھی ہے اور وہ یہ کہ جس بچے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے ماں باپ اس سے محبت نہیں کرتے، وہ یہ بھی یقین کر لیتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں اور وہ کسی کا نہیں۔ وہ اچھا ہو یا بُرا، نیک ہو یا بد، بزدل ہو یا بہادر، ملت فروش ہو یا محبّ الوطن، حسین ہو یا قبیح، کامیاب ہو یا ناکام، اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آپ پہلا ادھورا جواب پسند کریں یا دوسرا، بہر حال یہ ماننا پڑے گا آپ کو کہ ماں باپ کی محبت سے محروم بچہ یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ وہ کسی سے، کسی انسان سے، یا کسی بلند شعار سے، ملک سے یا ملت سے، محبت کرے۔ جو اپنی نگاہوں میں خود ذلیل ہے اس کے لئے کسی کو عزیز رکھنا ناممکن ہے۔

اکثر ایسے لوگ خودنگری میں اُلجھ جاتے ہیں۔ اس عزتِ نفس کی تلاش میں جس کے متعلق انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ خودنگری کے چکر میں الجھ کر وہ اپنے آپ میں اُسے پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے بغیر جینے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ جب تک یہ خودنگری کا چکر چلتا رہتا ہے، بغیر کسی خاص قباحت کے وہ اس میں مگن رہتے ہیں۔ جہاں کہیں انہیں کوئی ٹھوکر لگتی ہے یا کوئی صدمہ پہنچتا ہے، وہ جینے کا بہانہ بھی ختم ہو جاتا ہے جس کے بل بوتے پر ان کے فضائل و کردار کی شیرازہ بندی قائم تھی اور جہاں یہ شیرازہ بندی ختم ہوتی ہے، وہیں سے یہ انسانیت کے درجے سے گر کر پاگل و دیوانے بن جاتے ہیں یا کلی بہیمیت کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

یہ کہ ماں باپ کے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے بچے سے قطعی محبت نہ کریں۔ ان لاتعداد مریضوں کے حالات کی روشنی میں مانا نہیں جا سکتا جن کے ذکر سے سائیکوتھراپسٹ، سائیکوانالسٹ اور سائیکی ایٹرسٹ کی قسم کے معالجوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتا اکثر یہ ہے کہ ماں باپ ابھی الھڑ ہوتے ہیں۔ انہیں بچے جیسی نادر نعمت کی قدر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے الھڑ پن میں ایسی حرکات کر بیٹھتے ہیں جس سے ایک بچے جیسے حساس آبگینے کو ایسی ٹھیس لگتی ہے کہ عمر بھر یہ آبگینہ ٹھیک نہیں ہوتا، یا یہ کہ ماں باپ بالطبع عیاش واقع ہوتے ہیں اور انہیں اپنی عیش پرستی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ بچے کو اپنا بچہ سمجھتے ہوئے اس کی مناسب دیکھ بھال اور غور پرداخت کر سکیں۔

یا یہ کہ ماں باپ اس قدر امیر ہیں کہ وہ بچے کی پرورش اور نگہداشت کے لئے ایک چھوڑ کئی نوکر رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں، اور بچے کو ان کے حوالے کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض ماں باپ ہونے کی حیثیت سے ادا کر دیا۔

یا یہ کہ ماں باپ کسی وجہ سے ابھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہو، بے احتیاطی کہیے یا کچھ اور ان کے ہاں ان کی مرضی کے خلاف بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دل سے اس بچے کو رد کرتے ہیں، اس حد تک کہ کبھی بھی اسے اپنے بچے کی حیثیت سے قبول کرنے کو رضامند نہیں ہوتے۔

یا یہ کہ ماں باپ تن آسان ہیں اور لاڈ پیار سے بڑھ کر ان کے پاس بچے کو دینے کے لئے اور کچھ نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بچہ بری صحبت اختیار کر چکا ہے، غلط راہ پر چل نکلا ہے، پڑھائی سے جی چراتا ہے، اللہ رسول سے بالکل منہ موڑ چکا ہے، وہ اسے اُف تک کہنے کو تیار نہیں کہ کہیں وہ یہ سمجھ کر کہ انہیں تو اس سے پیار ہی نہیں ان سے بالکل منحرف نہ ہو جائے۔

یا یہ کہ.........

لیکن چھوڑیئے کہاں تک ماں باپ کی بچوں سے غفلت شعاری کی "زیرک" راہیں گنواتے چلے جائیں۔ مطلب تو صرف یہ تھا کہ آپ اس غلط فہمی سے بچیں کہ ماں باپ کو ایک بچے سے قدرتی طور پر بچہ پیدا ہوتے ہی وہ محبت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کی شخصیت کی صحیح تربیت کے لئے لازمی ہے، اور اگر کوئی بچہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہتا ہے اور عمر بھر کے لئے جذباتی مصائب کا شکار بن جاتا ہے تو اس میں بچے کا ہی قصور ہوتا ہے۔ ماں باپ بالکل بری الذمہ ہوتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کے تلخ تجربات ــــ مدرسے میں

مِس عزیز محمد حسین

بچے کی دنیا بظاہر تو وہی دنیا ہوتی ہے جس میں جوان بوڑھے سبھی رہتے ہیں۔ لیکن بچے کے لئے اس کی دنیا بڑوں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بچے کی ذات ایک اہم مرکز ہوتی ہے اور ہر چیز اس کے گرد گھومتی ہے۔ بچہ دنیا کو بڑوں کی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ اچھے بُرے، خوشی غمی کا معیار اس کا اپنا ہی ہوتا ہے۔

Otto Rank نے انسان کی تمام تلخیوں کی بنیاد خوف اور ڈر کو ٹھہرایا ہے۔ اس کی وضاحت اس نے اس طرح کی ہے کہ بچہ اس دنیا میں پیدا ہوتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک محفوظ، آرام دہ اور جانی پہچانی جگہ سے علیحدہ ہو کر ایک نئی، نامانوس جگہ میں آ گیا ہے۔ پیدائش کے وقت جس تلخ تجربے سے اُسے دوچار ہونا پڑتا ہے اس میں وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی میں پہلا اتفاق ہوتا ہے کہ اسے نہایت شدید قسم کے ڈر کا احساس ہوتا ہے۔ اس ڈر کا اظہار وہ رو کر کرتا ہے۔ اس رونے کو عام طور پر Birth Cry کہتے ہیں۔ یہ بچے کی زندگی کا پہلا شدید ترین تلخ تجربہ ہوتا ہے۔ آئندہ زندگی میں جب بھی بچے کو کوئی جسمانی یا جذباتی صدمہ پہنچے تو لاشعوری طور پر اسے اس پہلے تجربے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسے تلخ تجربات بچے کو سکول میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اور اُن کا اثر بھی دیرپا ہوتا ہے۔

تلخ تجربہ یا Tranmatic Experiment ایسے مختصر سے واقعے کو کہتے ہیں جس سے جذبات کو بری طرح ٹھیس پہنچتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ واقعہ تو اکثر بھول جاتا ہے لیکن اس کا اثر، تلخی کی صورت میں، لاشعور میں رہ جاتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے ملک میں عام طور پر بچے کے سکول میں داخلے کی عمر پانچ سال ہوتی ہے۔ ایک طرح سے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ پانچ سال کی عمر میں بچے کی ہر لحاظ سے نشوونما مکمل ہو جاتی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ پرائمری سکول کے نصاب کے مطابق اپنی عادات وغیرہ ٹھیک کرے گا۔ ایک پانچ سالہ بچے میں حیاتیاتی اور نفسیاتی قسم کی تمام وہ قابلیتیں اور صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جن کا آئندہ چند سالوں میں پختگی کی حد تک پہنچنا کامیاب زندگی کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ سکول میں داخلے سے پہلے بچہ بہت سی عادات سیکھ چکا ہے اور اپنے ماحول کو بھی بہت حد تک سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تمام عادات اور سوجھ بوجھ جو اس نے سکول آنے سے پہلے کے زمانے میں حاصل کی ہوتی ہے محض اتفاقیہ ہوتی ہے۔ مگر جب وہ سکول میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے والدین اور استاد اس سے وہ وہ توقعات رکھتے ہیں جو اکثر ایک پختہ کار سے کی جانی چاہئیں۔

سکول میں داخل ہونا بذاتِ خود بچے کے لئے ایک بہت اہم اور مشکل قدم ہوتا ہے۔ گھر کی محفوظ، پیار بھری اور چھوٹی سی دنیا جہاں اِدھر اُدھر ارد گرد سب اپنے ہی لوگ تھے، اِس دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ اُس دنیا کے مقابلے میں یہ دنیا نہایت ہی محبت اور اجنبی نظر آتی ہے۔

اس میں ہر شغل، ہر کام، اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ہوتا تھا۔ جب جی چاہا کھیلا، جب جی چاہا سوئے، جب جی چاہا کھایا۔ اس کے برعکس سکول میں کئی ایک پابندیاں اور بندشیں پائی جاتی ہیں۔ اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، کھیلنے پر بھی پابندی ہے۔ اوقات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

غرضکہ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ بچے کی ذات اب وہ اہم مرکز نہیں رہتی جس کے گرد ہر چیز گھومتی تھی، بلکہ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ بچہ سکول کے نظام کے مطابق گھومے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس شدید تبدیلی کے بعد سکول میں آتے ہی پہلے تین سالوں میں لکھنے پڑھنے کے لوازمات کو سیکھنا بھی اس کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ انہیں اچھی طرح سیکھ لینے پر اس کی آئندہ کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ بچہ اس قسم کے تلخ تجربوں کو بآسانی عبور کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کے لئے تیار ہو۔ بالفاظِ دیگر سکول میں داخلے سے پہلے بچے کی جسمانی، ذہنی اور جذباتی آمادگی ضروری ہے۔ ورنہ اس کے لئے سکول کی زندگی صرف تلخ تجربوں کا ایک طویل سلسلہ بن کے رہ جائے گی۔

بچے کی سکول کے لئے آمادگی اِن اثرات پر منحصر ہوتی ہے جن کو وہ اوائل عمر سے محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ دوسرے بچوں کے ساتھ گھل مل کر کھیلتا ہے۔ بڑوں کی دیکھ بھال سے اس حد

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک بے نیاز ہوتا ہے کہ اپنے جُوتے، کپڑے ان کی مدد کے بغیر پہن سکتا ہے، کسی حد تک صاف بات چیت کرسکتا ہے، اپنا مطلب سمجھا سکتا ہے اور دوسرے کا سمجھ سکتا ہے، والدین کے بغیر کچھ گھنٹے گزار سکتا ہے اور باہر آ جا سکتا ہے تو سکول جانے کی بہت سی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بچے کو سکول بھیجنے سے پہلے یہ فرض ماں باپ پر عائد ہوتا ہے کہ بچے میں کچھ خود اعتمادی پیدا کریں۔ اسے اپنا چھوٹا چھوٹا کام خود کرنے دیں، اسے مواقع بہم پہنچائیں جن سے وہ اپنے ہاتھ، پاؤں، پٹھوں کی ورزش کر سکے، جسم و عمل میں مطابقت پیدا کر سکے۔ اور اس کی مناسب حوصلہ افزائی کریں۔

سکول کا پہلا دن، یومِ پیدائش کا سا واقعہ ہوتا ہے۔ جو ہر بچے کو پیش آتا ہے۔ ماں باپ اور گھر چھوڑ کر اجنبی جگہ اور نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ سکول کے پہلے دن کا تجربہ اگر خوشگوار ہو تو بچہ اس خوف اور ڈر سے نجات پاتا ہے جو اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ بے بس اور تنہا ہے لیکن یہی تجربہ اگر ناخوشگوار ہو تو سکول کے خلاف ناخوشگوار احساسات عارضی یا مستقل طور پر سکول میں کامیابی کے راستے میں حارج رہتے ہیں اور آئندہ بھی اس کی ترقی کا راستہ روکتے ہیں۔

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ بچے کے سکول جانے کی تیاری بہت شوق سے کرتے ہیں۔ اس کے لئے کپڑے، جُوتے، قلم، پنسل اور کئی ایک نئی چیزیں منگواتے ہیں۔ اکثر گھر میں سکول کا تذکرہ رہتا ہے۔ بعض والدین تو سوال و جواب کا باقاعدہ طریقہ بھی سکھا دیتے ہیں۔ بار بار سکول کے متعلق باتیں سن کر بچہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ سکول اور وہاں کے طریقِ کار سے بخوبی واقف ہے۔ چونکہ سکول جانے کی تیاری کو گھر میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ بچہ بھی سکول کے نام سے مانوس ہو جاتا اور ہنسی خوشی سکول جاتا ہے اور سکول کے مختلف تجربات کے لئے تیار ہوتا ہے۔ مگر سکول شروع ہوتا ہے۔ بچہ اُچھلتا کودتا جماعت میں پہنچتا ہے۔ اپنی استانی صاحبہ سے بہت سی اُمیدیں باندھ کر بیٹھتا ہے۔ استانی صاحبہ جماعت میں داخل ہوتی ہیں وہ نہایت فرعون قسم کی ہیں۔ ماتھے پر تیوریاں، نہایت کرخت لہجہ، ذرا ذرا سی غلطی پر ڈانٹ دیتی ہیں، سوال پوچھتی ہیں تو گرج کر۔ یہ رنگ دیکھ کر بچے کا دل مرجھا جاتا ہے، سکول آنے کی خوشی کافور ہو جاتی ہے، سکول اچھی خاصی مصیبت بن جاتا ہے۔ چونکہ بچہ ایسے سلوک کا عادی نہیں ہوتا اس لئے یہ تجربہ اس کے لئے نہایت تلخ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی اُمیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ایسے تجربات کا اثر بہت دیرپا ہوتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک ایسی استانی صاحبہ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نجات نہیں ملتی اور ایک مشفق استانی پہلے تلخ تجربے کا احساس بچے کے ننھے سے دل سے دُور نہیں کر دیتی۔ اگر بدقسمتی سے اسی بچے سے متعلق کسی دوسری استانی صاحبہ کا رویہ پہلی استانی صاحبہ کے رویے جیسا ہی ہوتا ہے تو بچے کی شخصیت اس سے بہت اثر پذیر ہوتی ہے۔ بچہ ہر کام کرنے سے پہلے جھجکتا ہے، اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کہیں کوئی ناراض نہ ہو، ٹوک نہ دے۔ بچے کو اپنے اوپر وہ اعتماد نہیں رہتا جسے وہ گھر میں اپنی امی کی نظروں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ بچے پر سکول کے ایسے تلخ تجربات کا اثر عمر بھر قائم رہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس قدر ڈرپوک بن جائے کہ زندگی کی ہر نئی چیز اسے ہوّا نظر آئے۔

اس کے برعکس اس بچے کی حالت بہت ہی قابلِ رحم ہوتی ہے جو سکول جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ لاڈلا بچہ جو ہر وقت ماں کے گھٹنے سے لگا رہتا ہے یا ماں کی گود میں سو رہنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ایک دن اپنے آپ کو نہایت بے بس پاتا ہے۔ ابا میاں سکول لے جاتے ہیں تو بچہ رو رو کر ہلکان ہو جاتا ہے، گود سے نہیں اُترتا، ابا کی انگلی نہیں چھوڑتا، ٹانگوں سے لپٹا جاتا ہے، گھنٹے آدھ گھنٹے کی کش مکش کے بعد ابا کو اگر کامیابی ہو بھی جائے اور بچہ جماعت میں داخل ہو جائے تو سارا کمرہ رو رو کر سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ اسے روتا دیکھ کر باقی ننھے منے بھی، جو اب تک خاموش بیٹھے تھے، بے بس ہو جاتے ہیں اور رونے والے کا ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں۔ جماعت میں کہرام مچ جاتا ہے۔ ایک دو گھنٹے، جو اس طرح بچہ سکول میں گزارتا ہے، اس کے لئے قیامت کے برابر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نہایت مجبور پاتا ہے۔ ایسے بچے کو سکول جتنا بھی بُرا لگے کم ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر والدین اور سکول کا آپس میں تعاون ہو اور بچے کی دنیا میں جو تلخ تجربے سکول میں پیش آتے ہیں کم ہو جائیں۔

میں چند خاص قسم کے تلخ تجربوں کے واقعات بیان کرتی ہوں۔ بڑی عمر کے لوگوں کو شاید ان میں کوئی تلخی دکھائی نہ دے لیکن بچوں کے احساسات ان سے ضرور مجروح ہوتے ہیں۔

(1) چھوٹے چھوٹے ننھے منے بچوں کی جماعت ہے۔ انہوں نے ابھی "میری گڑیا" نظم گا کر ختم کی ہے۔ نجمہ بہت خوشی سے گا رہی تھی۔ اسے بہت لُطف آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ گڑیا ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے باتیں کر رہی ہے۔ گانا ختم ہوا۔ استانی صاحبہ نے اتفاق سے نجمہ کو ہی پکارا "نجمہ کوئی دوسری نظم شروع کرو۔" نجمہ کو ایک دم تمام نظمیں بھول گئیں۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔اس طرح ساری جماعت کے سامنے پکارے جانے پر اُسے اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ جو نظمیں یاد تھیں وہ بھی بھول گئیں۔ دومنٹ کے بعد اس نے نہایت بے کسی سے اُوپر دیکھا۔اب استانی صاحبہ نے بلند آواز سے دوبارہ حکم دیا۔ پھر بھی جب نجمہ کو کوئی نظم یاد نہ آئی تو کہنے لگیں۔ "تمہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔تم تو بالکل بدھو ہو۔" اس کے بعد کسی دوسرے بچے نے نظم شروع کر دی اور تمام بچے خوشی خوشی اس میں شریک ہو گئے۔

اس واقعے کا اثر جو نجمہ پر ہوا وہ نہ اس کی استانی صاحبہ جانتی ہیں نہ جماعت کے باقی بچے۔ اس کا اندازہ کچھ نجمہ ہی کر سکتی ہے۔جس کے جذبہ، خودداری اور خود اعتمادی کو اس قدر ٹھیس لگی ہے۔اس نے محسوس کیا کہ ہم جماعتوں کے سامنے اس کی بہت بے عزتی ہوئی ہے اور وہ شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی۔اس تلخ تجربے کا اثر اس کے باقی دن کے کام پر بھی پڑا۔اسی دن جماعت میں حساب کا پیریڈ تھا۔جمع کے سوال ہو رہے تھے۔دو موتی کالے تھے اور دو سفید تھے۔استانی صاحبہ نے پوچھا "کیوں نجمہ یہ سب موتی کتنے ہوئے؟" استانی صاحبہ کو پاس کھڑے دیکھ کر نجمہ کو صبح کا واقعہ پھر یاد آ گیا۔اس کی شرمندگی اور غم پھر تازہ ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ استانی صاحبہ کو جب جواب نہ ملا تو بہت بگڑیں اور کہنے لگیں۔ "آج نجمہ خدا جانے کیا کھا کر آئی ہے، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر رہی۔" انہوں نے یہ کہہ کر دوسرے بچے کی جانب رُخ کر لیا۔ نجمہ کو ایک تو پہلا صدمہ ہی نہ بھولا تھا، اب اس میں اور اضافہ ہو گیا۔اس کے باوجود سکول روز آنا پڑا۔لیکن نجمہ کو آئندہ جماعت میں کوئی بھی کام کرنے میں خوشی محسوس نہ ہوئی۔اسے یہی خیال رہتا کہ استانی صاحبہ اور باقی جماعت کو اس دن والی میری بے عزتی یاد ہو گی اور ہر کام کرتے وقت وہ ہمیشہ جھجکتی رہی۔استانی صاحبہ کے اس سلوک نے ایک بچی کا تمام جوش ختم کر دیا۔ایسے واقعات روزانہ تقریباً ہر سکول میں پیش آتے رہتے ہیں۔

اساتذہ بھی اگر غور کریں تو محسوس کریں گے کہ اکثر ایسا واقعہ اُن کے ساتھ بھی پیش آیا ہوگا اور ایک ہی بچے کو ایک دو بار سے زیادہ ٹوکنے یا ناراض ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا۔بظاہر یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک حساس بچے پر اس کا اثر بہت زیادہ ہو سکتا ہے۔استاد کے سخت رویے سے بچے کی زندگی سنورنے کی بجائے بگڑ سکتی ہے۔اگر بچے کے دل کو ٹھیس لگی ہو تو کم از کم ان تمام مضامین سے جو ڈانٹنے والی استانی صاحبہ پڑھاتی ہوں اسے نفرت سی ہو جاتی ہے۔جب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابتدائی جماعتوں کا یہ عالم ہو تو بڑے ہونے تک یہ خاص واقعہ بھول تو جاتا ہے مگر اس کا اثر رہ جاتا ہے، یعنی بچہ حساب یا تاریخ سے بھاگتا ہے۔ ان مضامین کو دل لگا کر نہیں پڑھتا یا اگر پڑھتا ہے تو کچھ کامیابی نہیں حاصل کرتا۔ نمبر بھی کم حاصل کرتا ہے۔ اس وقت سب بزرگ یہی کہتے ہیں کہ خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے کہ پڑھتا ہی نہیں۔ سوائے بچے کے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ استانی صاحبہ نے اس کا شوق شروع ہی میں کچل دیا تھا۔ بلکہ اکثر اوقات بچے کو بھی ڈانٹ ڈپٹ تو یاد نہیں رہتی البتہ وہ اس کا اثر محسوس کرتا ہے۔

(2) ننھا نعیم سات سال کا تھا۔ ہر روز بھائی کے ساتھ سکول جاتا تھا۔ بھائی اسے اس کے کمرے کے باہر چھوڑ کر خود اپنی جماعت میں چلا جاتا تھا۔ اس کی جماعت کا کمرہ صحن کی دوسری طرف تھا۔ ایک دن نعیم جماعت میں پہنچا تو کمرے میں کوئی بچہ نہ تھا۔ سکول کا مہتر کمروں کی صفائی کر رہا تھا۔ کمرے کو صاف کر کے وہ دروازہ بند کر گیا۔ نعیم نے اپنی کتابیں ڈیسک پر رکھیں اور بستے میں سے گیند نکالی۔ گیند ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے پکڑنے کے لئے وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ جماعت کے کونے میں اس نے دیکھا کہ بڑا سا کتا بیٹھا تھا۔ کالے رنگ کا کتا اور چمکتی ہوئی آنکھیں! کتے نے غور سے نعیم کی طرف دیکھا اور نعیم کا خون خشک ہو گیا۔ ڈر کے مارے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اسے اتنا ڈر محسوس ہوا کہ بھاگنے کے لئے پاؤں نہ اُٹھا سکا۔ کتے کے پاس سے گیند لڑھکی تو اس نے اُٹھ کر اسے سونگھا۔ ابھی تک کمرے میں کوئی اور بچہ نہ آیا تھا۔ نعیم نے چاہا کہ بھاگ جائے۔ دروازے تک گیا۔ اُسے کھولا تو بند پایا۔ مہتر اس خیال سے اُسے بند کر گیا تھا کہ دوسرے کمرے کی مٹی اندر نہ آنے پائے۔ اب تو نعیم کے ہوش گم ہو گئے اور وہ رونے لگا۔ اُس دن سے وہ کبھی اکیلا کسی گھر یا کمرے میں نہیں جاتا۔ کہتا ہے کہ اکیلا نہیں جاؤں گا۔

یہ ایک عام تجربہ ہے جو بچوں کو سکول جانے کے دوران میں پیش آ سکتا ہے۔ کبھی اکیلے رہنے کا اتفاق ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن امکانات ہوتے ہیں کہ اگر بچے کے ڈر کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے اور اُسے اس قسم کے ڈر سے نجات نہ دلوائی جائے تو آئندہ ساری عمر وہ پریشانی میں گزارے گا۔ ماہرینِ نفسیات کے پاس کئی دفعہ ایسے مریض آتے ہیں جن کے بند کمرے سے بدکنے، سڑک پر اکیلے چلنے سے ڈرنے اور اندھیرے سے خوف کھانے کی وجہ اسی قسم کا تلخ تجربہ ہوتی ہے جیسا کہ نعیم کو پیش آیا۔ بچے کی عمر کے اس حصے میں اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچہ بہت ڈرتا ہے۔تو اسے اکیلے چھوڑنا یا اور زیادہ ڈرانا کوئی عقلمندی نہیں۔ بچے کو پیار اور محبت کی اشد ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ محسوس کرے کہ اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ اسی طرح بچے میں سزا، مار پیٹ کا ڈر پیدا کرنا بھی اس کی ذہنی صحت کے لئے مفید نہیں۔ مار پیٹ اور سزا سے زیادہ کام پیار سے نکلتے ہیں۔

(3) ارشد دس سالہ بچہ تھا۔ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بہت خوش شکل، خوش مزاج، بھاری بھرکم اتنا کہ بھاگنے دوڑنے سے سانس چڑھ جاتا۔ جماعت کے بچوں کے ساتھ خوب گھل مل کر رہتا تھا۔ جماعت میں اس کے بہت سے دوست بھی تھے۔ پڑھنے لکھنے میں ذرا لاپرواتھا اور اکثر کام نہ کرنے پر استانی صاحبہ اُسے ٹوکتی رہتی تھیں۔ ایک دن استانی صاحبہ سب بچوں کا کام دیکھ رہی تھیں، جماعت میں بالکل خاموشی تھی، سب کھڑے تھے، جو بچے کام دکھا چکتے وہ بیٹھ جاتے۔ استانی کام دیکھتے ہوئے ارشد کے پاس رکیں، اس کے ہاتھ میں کاپی نہ تھی۔ انہوں نے ارشد سے پوچھا: ''تمہاری کاپی کہاں ہے؟'' ''باجی! میری ٹاپی ڈُم ڈی ہے۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ ساری جماعت اور استانی صاحبہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں۔ ارشد کا منہ سُرخ ہوگیا۔ غالباً اب تک بچوں نے کبھی ارشد کی یہ خامی نوٹ نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کی شکل دیکھ کر ہنس دیتے۔ سارا دن ''ٹاپی ڈُم ڈی'' کے آوازے نعرے لگاتے۔ چار پانچ ماہ کے بعد بچوں کو ارشد جماعت میں نظر نہ آیا۔ جب ہفتہ بھر وہ غیر حاضر رہا تو معلوم ہوا کہ اس نے سکول تبدیل کر لیا ہے۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے ہر شخص کو زندگی میں ایسا واقعہ کبھی نہ کبھی ضرور پیش آیا ہوگا کہ زبان سے غلط الفاظ نکل گئے ہوں یا کبھی دوستوں نے غلط استعمال کردہ الفاظ کا مذاق بنا لیا ہو۔ اس حد تک تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن اگر کسی غلطی کا بری طرح مذاق اڑایا جائے اور غلطی کرنے والے کو اس کا احساس ہو جائے کہ اس میں یہ ایک بڑی خامی ہے تو آئندہ جب بھی وہ اس لفظ کو ادا کرے گا تو اُسے مذاق کا واقعہ اور اپنی شرمندگی یاد آ جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ لفظ شرم اور جھجک ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم بن جائیں گے اور اسی ہچکچاہٹ میں وہ لفظ بھی غلط ہی ادا ہوگا۔ آئندہ کے لئے الجھن بھی بڑھ جائے گی۔ بچپن تو گزر جاتا ہے۔ لیکن بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس عادت سے پیچھا چھڑائے۔ وہ دوسروں کے لئے مذاق و تفنن کا باعث بن جاتا ہے۔ تتلاہٹ کے بہت سے مریض کسی بیماری کے باعث نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تتلاتے۔ ماہر نفسیات نے ایسے کئی مریضوں کے واقعے بیان کیے ہیں جن کا انہوں نے علاج کیا اور معلوم کیا کہ مرض کی اصلی وجہ جذباتی ہیجان (emotional tension) ہی تھی۔ ایسے مریض جب کبھی تنہائی میں تسلی سے بلند آواز سے کچھ پڑھیں تو نہیں ہکلاتے۔ گانا گاتے وقت بھی نہیں ہکلاتے۔ لیکن جب کسی دوسرے کے ساتھ بات کریں تو انہیں یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ غلطی ہوئی تو دوسرا مذاق اڑائے گا اور اسی وجہ سے غلطیاں اور بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ اسکول میں استاد ایسے موقعوں پر بچے کی مدد کر سکتا ہے۔ جہاں پیار و شفقت اور ہمدردانہ مدد سے بچے کی بہت سی پریشانی دور ہو سکتی ہے وہاں سخت اور خشک برتاؤ یہ الجھنیں پیدا بھی کر دیتا ہے۔

(4) اسلم چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کی جماعت میں پینتالیس لڑکے تھے۔ کمرہ تو خاصا کھلا اور ہوا دار تھا لیکن پینتالیس ڈیسک اور پینتالیس کرسیاں رکھنے کے بعد چلنے پھرنے کی جگہ کم ہی رہ جاتی تھی۔ جماعت تین حصوں میں منقسم تھی تا کہ لڑکوں کو آنے جانے میں سہولت ہو۔ کمرے کی دو دیواروں پر سیاہ تختے بنے ہوئے تھے۔ دو چار دن سے متواتر بوندا باندی ہو رہی تھی، اس لئے لڑکوں کی روزانہ حاضری بھی بہت کم ہوتی تھی۔ پانچویں دن جب مطلع صاف ہوا اور تقریباً سب لڑکے حاضر تھے تو استانی صاحبہ نے ان کے کام کی پڑتال شروع کی۔ وہ اپنی ڈائری میں سے کسی لڑکے کا نام پڑھتیں۔ جس نے پچھلے بہت دنوں سے کام نہیں دکھایا تھا وجہ پوچھتیں، اسے ہدایت دیتیں اور پھر دوسرے لڑکے کو پکارتیں۔ اسی طرح اسلم کی باری بھی آ گئی۔ ایک دفعہ پکارنے پر یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ حاضر ہے لیکن یہ پتا نہ لگا کہ کہاں سے بول رہا ہے؟ دوسری دفعہ اور پھر تیسری دفعہ جب استانی صاحبہ نے اس کا نام لیا تو بہت سے لڑکے بتانے لگے کہ یہ بیٹھا ہے وہ بیٹھا ہے۔ جب استانی صاحبہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا کہ ''کہاں ہو؟ کھڑے ہو جاؤ!'' تو اسلم کھڑا ہو گیا۔ استانی صاحبہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''بھئی ذرا تختہ سیاہ سے دور بیٹھا کرو۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تو تم نظر ہی نہیں آتے۔'' لڑکوں کو بہت ہنسی آئی لیکن اسلم بیچارہ خاموش رہ گیا۔ اس کے بعد جب بھی اسلم سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ سر جھکا کر ہی کھڑا ہوتا اور کبھی کبھی تو لڑکے 'تختہ سیاہ' کا لفظ بھی بولتے۔

ایسے تجربات بھی بچے کی دنیا میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں اور بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح بچہ اپنے آپ کو مذاق سے محفوظ رکھنے کے لئے الگ تھلگ ہی رہتا ہے۔ دو ایک مرتبہ اگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اِسی طرح کا تلخ تجربہ پیش آئے تو بچہ پوری طرح احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ بڑے ہو کر یہ احساس اس کے لئے نہایت تکلیف کا موجب بنتا ہے اور یہ تلخی اس کے کردار سے ظاہر ہوتی ہے۔

(5) چھوٹے بچوں کے لئے اکثر سکول اور کمرہ جماعت کے حالات، جذباتی ہیجان (emotional tension) کا باعث ہوتے ہیں اور ان کے لئے اپنے آپ کو سکول کے مطالبات کے مطابق بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ عموماً ان کی نیند کم ہو جاتی ہے بھوک کم لگتی ہے، وزن بھی کم ہو جاتا ہے، اکثر مائیں یہ کہتی سنی گئی ہیں کہ جب سے بچے نے سکول جانا شروع کیا ہے کمزور ہو گیا ہے۔ اس کا علاج یہی ہوتا ہے کہ بچے کی مدد کی جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو سکول کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لے۔ سکول جانے کے لئے صبح جلدی اٹھنا، جلدی جلدی ناشتہ کرنا تو ایک عام چیز ہے۔ سکول سے چھٹی کی خواہش میں بھی اسی تکلیف کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے متعلق تو فکر کی خاص ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ بڑے بچے بھی گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب سکول جاتے ہیں تو ہفتے بھر کے بعد ہی دوبارہ سکول آنے جانے کے عادی ہوتے ہیں لیکن تشویش تو اس وقت ہوتی ہے جب بچہ ضرورت سے زیادہ سکول جانے کے نام سے گھبراتا ہے یا سکول جاتے ہوئے روتا ہے۔ ایسے واقعات کی جب بھی چھان بین کی جائے، وجہ یہی ہوتی ہے کہ بچے کو کوئی سخت قسم کا صدمہ ہوا ہے یا اس کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے راحت کو بھی ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا۔ راحت کی والدہ ایک دن سکول تشریف لائیں۔ وہ بہت ہی پریشان تھیں کہ اُن کا بچہ پہلی اور دوسری جماعت میں تو سکول خوشی خوشی آتا تھا۔ لیکن اب پندرہ بیس دن سے وہ اس قدر ضد کرنے لگا ہے کہ کسی صورت سکول جانے کو تیار نہیں ہوتا، روتا ہے لیکن کہتا کچھ نہیں، بتاتا بھی کچھ نہیں۔ پانچ چھ دن سے تو رات کو بھی ڈر کر اُٹھ بیٹھتا ہے اور اُستانی کا نام لے کر روتا ہے کہ میں سکول نہیں جاؤں گا۔ راحت اُن کا بڑا بچہ تھا، ساڑھے سات سال کی عمر تھی، لاڈلا بھی بہت تھا لیکن ماں باپ دونوں بے جا لاڈ نہیں کرتے تھے بلکہ سکول کے معاملات میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ جب وہ چار پانچ بار رات کو بھی رو رو کر اٹھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ بچے کو پیار کیا، سوال پوچھے لیکن کچھ تسلی بخش جواب نہ ملا۔ ماں نے اُسے گود میں اُٹھایا اور پیار کرتے ہوئے جب اپنا ہاتھ اُس کے سر پر پھیرا تو راحت رو کر کہنے لگا کہ "درد ہوتا ہے۔" دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُستانی foot rule سے اکثر مارتی ہیں اور اس سے اگلے دن تو سر پر بہت بُری طرح مارا تھا اور سر میں تکلیف ہے۔ یہ بتاتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے راحت اور بھی زیادہ رونے لگا۔ جب تفصیلات پوچھی گئیں تو راحت نے بتایا کہ اس کی استانی صاحبہ اُسے بہت مارتی ہیں۔ صبح ہی سے ڈانٹ اور مار پیٹ شروع کر دیتی ہیں۔ طعنے بھی دیتی ہیں۔ بدقسمتی سے اس کا آغاز ہوا کہ ایک دن راحت کے سب سوال غلط نکلے۔ اس دن استانی صاحبہ کا موڈ ویسے ہی بگڑا ہوا تھا۔ سب پر برس رہی تھیں۔ اس دن کے بعد سے راحت کے ہر کام میں انہیں غلطیاں ہی نظر آنے لگیں۔ راحت چونکہ حساس تھا۔ اس نے اس میں اپنی سبکی محسوس کی کہ گھر آ کر بتائے یا امی سے اس کا ذکر کرے، اور سکول میں اب چونکہ اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی، وہ کام میں بہت پیچھے رہ گیا اور استانی صاحبہ اور بھی بگڑ گئیں۔ اب راحت کی والدہ سکول تشریف لائیں کہ حالات معلوم کریں اور مشورہ حاصل کریں۔ جب تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ پہلی اور دوسری جماعت میں استانیاں مختلف تھیں۔ ان کا رویہ بچوں کے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ اب تیسری جماعت میں یہ آدم بیزار سی استانی تھیں جنہیں بچوں کے ساتھ کوئی اُنس نہ تھا۔ نہ کبھی بچوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان کے خلاف ایسی اور بھی چند ایک شکایتیں تھیں۔ بچے کے دل میں اُن کی دہشت یوں بیٹھی تھی کہ وہ کسی صورت بھی ان کی جماعت میں جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا سیکشن تبدیل کر دیا گیا تب وہ بمشکل سکول جانے پر راضی ہوا۔ غالباً استانی صاحبہ چند دنوں کے بعد بھول گئی ہوں گی کہ راحت کے ساتھ انہوں نے سخت سلوک کیا تھا۔ لیکن بچے کو یہ تلخ تجربہ مشکل سے ہی بھولے گا۔ بچے کے دل میں جو خیالات و احساسات استانی صاحبہ یا authority figure کے لئے ایسے تلخ تجربے کے نتیجے کے طور پر پیدا ہو جاتے ہیں وہ اس کی آئندہ زندگی کو بھی تلخ کر دیتے ہیں۔ بچے کا بزرگوں پر بھروسا، اعتبار یا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور سکول اور پڑھائی سے دل اُچاٹ ہو جانا تو بڑی بات نہیں۔

یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہو گا کہ کبھی کبھار کی ڈانٹ ڈپٹ ضرر رساں نہیں ہوتی۔ ہمارے ماحول میں ماں باپ اور استاد اکثر اپنی ہی الجھنوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور وہ اپنے فرائض پوری طرح ادا نہیں کرتے۔ بچے تو ہمیشہ نچلے ہوتے ہیں۔ ان کا تجسّس، چلبلا پن، بھاگ دوڑ اور شرارت یہ سب چیزیں بڑوں کے لئے بہت صبر آزما ثابت ہوتی ہیں۔ اپنی ذاتی پریشانیوں کے باعث مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے اور وہ بچوں کے ساتھ سختی کر بیٹھتے ہیں۔ یہ سختی نقصان دہ اس وقت ہوتی ہے جب لگاتار کی جائے یا جب شفقت اور ہمدردی کا کوئی بھی عنصر ان کے رویّے میں نہ ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور بچے میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اس سے سختی کی جا رہی ہے اور وہ پیار سے بالکل محروم ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے۔ یہ محرومی بھی اس کے لئے ایک بہت بڑا تلخ تجربہ ثابت ہوتی ہے۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کی رہنمائی میں اُستاد کا حصہ

پروفیسر ابراہیم شمیم

موجودہ زمانہ، سائنسی ترقی اور حیرت انگیز دریافتوں کا دور ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جس کے بارے میں علمی معلومات اور واقفیت میں بیش از بیش اضافہ نہ ہوا ہو۔ انہی سائنسی ایجادات کے طفیل آج ایک خاتون کو چولہے میں ایندھن جلانے اور دھوئیں سے دیدے پھوڑنے کی بجائے، تیل یا بجلی کا چولہا جلانے میں کتنی سہولت ہوتی ہے۔ جو سفر مہینوں میں طے ہوتا تھا، اب گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ سائنس دان زندگی کو آسان سے آسان تر بنانے میں مصروف ہیں۔ لیکن ان فنی کمالات اور ایجادات کے باوجود کچھ قدریں اور روشیں ایسی ہیں جن پر انسان حسبِ سابق قائم ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم و تعلم یا درس و تدریس ایک ایسی سماجی سرگرمی ہے جس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ بدستور قائم ہے۔ یعنی بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں انسان ابھی استاد کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوا۔ ''تعلیم بذریعہ خط و کتابت'' یا ''تعلیم بذریعہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ___ '' یہ سب کچھ ایجاد ہوا لیکن پھر بھی استاد کہیں نہ کہیں پوشیدہ ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تعلیم و تدریس کے دائرے سے استاد کی شخصیت کو خارج کر دینا فی الحال ناممکن ہے۔

اگر استاد کا رول یا کردار فقط اتنا ہوتا کہ وہ علمی معلومات یا چند تاریخی و جغرافیائی حقائق خود اخذ کر کے بچے کے ذہن میں داخل کر دیتا تو قرینِ قیاس ہے کہ استاد نہ صرف اپنے رُتبے سے گر جاتا بلکہ سماجی موت مر چکا ہوتا، لیکن استاد آج بھی وہی کردار ادا کر رہا ہے جو صدیوں پہلے کرتا تھا۔ بچے کی شخصیت کی نشوونما میں آج بھی اس کا وہی حصہ ہے جو ماضی بعید میں ___ اچھا استاد ایک اچھے آرٹسٹ کی طرح شخصیتیں مرتب کرتا ہے اور زندگیوں کے نقش اُبھارتا ہے۔ سکول یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کلاس کے چھوٹے سے سماج میں استاد شفیق باپ بھی ہوتا ہے اور مخلص دوست بھی۔ رہنما بھی ہوتا ہے، اور ہم سفر بھی۔ وہ لیڈر بھی ہوتا ہے اور شریکِ کار بھی۔ وہ مصور بھی ہوتا ہے اور نقاد بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس بے تعلقی اور بے راہ روی کے زمانے میں بھی شاگرد اپنے اچھے استادوں کا احترام کرتے ہیں اور اُن کے احسانات کی قدر شناسی کرتے ہیں۔

سماجی کردار کی تشکیل

اُستاد کے کردار کی اہمیت سے متعلق اس وقت تک جو کچھ کہا گیا ہے اسے عمومی اور تسلیم شدہ کہا جا سکتا ہے۔ آیئے اب یہ دیکھیں کہ استاد اپنے شاگرد کی زندگی کے ذہنی، جذباتی اور فعال پہلوؤں پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کا بنیادی اصول یہ نہیں کہ بچے کو (ا ب ت پڑھایا جائے بلکہ اُس کی سماجی حس کو بیدار کرنا اور تقویت دینا ہے۔ چونکہ انسان ایک دوسرے کا جزو ہوتے ہیں، اس لئے سماجی نشو ونما بھی ایک دوسرے سے مل کر رہنے، کھیلنے اور کام کرنے سے ہوتی ہے۔ اپنے کھلونے دوسرے ساتھیوں کو دینا، کھانے کی چیز بانٹ کر کھانا، اپنی چیز کی حفاظت کرنا، دوسرے کی چیز نہ لینا۔ دوسروں سے مل کر کھیلنا، مل کر گانا، یہ تمام تربیت بچے کی آئندہ زندگی کے سماجی پہلو کو مضبوط کرتی ہے اور اسے خودمرکزیت کے دائرے سے نکلنے میں مدد دیتی ہے۔ استاد اُن تمام سرگرمیوں پر کڑی نگرانی رکھتا ہے اور فرداً فرداً ہر ایک کی مدد کرتا ہے تا کہ آئندہ چل کر بچوں کو سماجی اور گروہی زندگی بسر کرنے اور اُس کے تقاضوں سے مطابقت کرنے میں دشواری نہ ہو۔ جو بچے خودغرض، لالچی یا اپنی ذات کو ہر بات پر فوقیت دینے والے ہوتے ہیں، وہ بڑے ہو کر جذباتی ہچکولوں اور یاسیت کا شکار ہوتے ہیں۔

ذہنی نشو ونما

ذاتی تقاضوں اور سماجی کردار میں ہم آہنگی کے علاوہ استاد بچے کے تجسس اور حیرت کے میلانات کو بیدار کرتا ہے تا کہ بچہ اشیاء، حالات اور محلات کو پرکھنے اور سمجھنے میں قدرت حاصل کر سکے۔ وہ تعلیمی مواد کو اسی طرح پیش کرتا ہے کہ بچوں کی سوئی ہوئی صلاحیتوں میں تحریک ہوتی ہے۔ وہ اسے بطور چیلنج کے قبول کرتے ہیں۔ اجنبی اور پُر کشش محلات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com: مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ وہی ذہنی میلانات ہیں کہ اگر اچھی طرح نشو ونما پا جائیں تو بچوں کو سائنس دان یا تحقیق میں دلچسپی لینے والے انسان بنا دیتے ہیں۔ انہیں سے بچہ منفرد سوچ بچار اور منفرد کردار کا اہل بنتا ہے۔

جذباتی توازن

اس میں کچھ شک نہیں کہ جذباتی توازن پیدا کرنے میں ماں باپ اور گھر کے ماحول کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے لیکن جذباتی ترقی میں استاد کو بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بچوں کے شخصی تقاضے اور ہوتے ہیں اور جماعتی تقاضے اور۔ ان دونوں میں باہم تال میل پیدا کرنا کہ بچہ ضرورت سے زیادہ لڑاکا یا شکست خوردہ محسوس نہ کرے، استاد ہی کا کام ہے۔ بعض بچوں کے جذباتی ردِ عمل بڑے شدید قسم کے ہوتے ہیں، حالانکہ محرکات بہت معمولی ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر وہ چیخیں مار مار کر رونے لگتے ہیں اور فرمایا کرتے ہیں انہیں اپنے پر اعتماد نہیں ہوتا اور دوسروں کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں سے الجھتے ہیں اور دوستی کو نبھا نہیں سکتے۔ اگر ابتدا سے ہی بچے کو اس روش پر نہ چلایا جائے جس سے کہ اُس کے جذباتی ردِ عمل میں ایک توازن اور خوبصورتی ہو تو بڑے ہو کر نہ وہ اچھا کارکن بن سکتا ہے اور نہ رہنما۔ اس سلسلے میں اچھے استاد کی خدمات کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

سیرت کی ترتیب

بعض ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ بچے کی زندگی کے پہلے پانچ سات سال بہت اہم ہوتے ہیں کیونکہ اسی وقت میں بچے کا کیریکٹر یا سیرت مرتب ہو جاتی ہے۔ ہم یہاں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ انسانی شخصیت میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ وہ عمر بھر بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت کرتا رہتا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان زندگی کی ہر منزل میں آموزش کا اہل ہوتا ہے۔ استاد میں اگر اتنی صلاحیت ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کی اہلیتوں کا جائزہ لے سکے۔ بچوں کے رجحانات، شوق اور جاذبیتوں کا اندازہ کر کے انہیں ایسے مشاغل مہیا کرے، جن سے ان کے میلانات کی تسکین ہوتی رہے تو بچوں کے اندازِ فکر و تخیل یا افعال و کردار میں نہ صرف پختگی پیدا ہو جائے گی بلکہ استواری اور دوام بھی آ جائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ سیرت مرتب ہو جائے گی، قول و فعل میں ربط نمودار ہوگا اور ان کے افعال و کردار پر بھروسا کیا جا سکے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعلیمی رہنمائی

اس ایٹمی دور میں جہاں ہر شے بڑی سُرعت سے بدل رہی ہے، استاد کے تعلیمی کردار اور اس کی ذمہ داریوں میں بھی تبدیلیاں اور اضافے ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آج سے چند سال پہلے تک ہمارا نظامِ تعلیم یک رنگ اور یک سمتی تھا۔ ہر طالب علم کے سامنے ایک ہی مقصد تھا یعنی میٹرک یا بی۔اے پاس کرنا۔ لازمی مضامین کی بھرمار تھی۔ سات آٹھ مضامین میں سے اسے بہر حال پانچ مضامین چننا پڑتے تھے۔ اس میں فطری میلان، شخصی پسند یا انتخاب کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے مطابق نظامِ تعلیم میں بہت کارآمد تبدیلیاں ہو رہی ہیں جن میں سب سے اہم پائیلٹ (Pilot) سکولوں کا اجراء ہے۔ مغربی پاکستان میں ایسے بائیس سکول ہیں جن پر حکومت نے زرِ کثیر صرف کر کے، بہت سے نئے مضامین داخل کیے ہیں۔ استاد اور ساز و سامان دے کر طلبہ کے لئے امکان مہیا کیا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت، شوق اور طبعی رجحان کے مطابق مضامین انتخاب کریں اور تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے آپ پر بھروسا کرنے والے کارآمد شہری بن سکیں۔ چنانچہ ایسے سکولوں میں عام سائنس، زراعت، گھریلو اقتصادیات (ہوم اکنامکس)، صنعتی فنون اور تجارتی تعلیم کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ اساتذہ کو تعلیمی رہنمائی کی فنی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ وہ بچوں کے بارے میں تفصیلی حالات مہیا کر سکیں۔ اور روز افزوں یا Cummulative Records تیار کریں۔ اور اگر کہیں ہو تو ذہنی یا شخصی آزمائشوں سے بچوں کی ذاتی ساخت کا پتا چلائیں۔ بچوں کے کردار کا گہرا اور طویل مطالعہ کریں۔ ان کے شوق اور معلومات سے متعارف ہوں تاکہ جب ایک بچہ نویں جماعت تک پہنچے تو استاد جمع شدہ تفصیلی ریکارڈ کی مدد سے اس کی رہنمائی کر سکے کہ اُسے کس سمت جانا چاہیئے۔ اساتذہ کا یہ نیا کردار بیک وقت مشکل بھی ہے اور مفید بھی۔ چند سالوں کے بعد جب ملک کے اقتصادی وسائل بہتر ہو جائیں گے اور تمام نظامِ تعلیم، نئے رنگ میں رنگا جائے گا تو تعلیمی رہنمائی محض دُعا یا حوصلہ افزائی کا نام نہ ہوگا بلکہ ایک فن اور تکنیک ہوگی جسے ابتدائی تربیت کے دوران ہر ہونے والے استاد کو سیکھنا ہوگا اور ہر سکول میں ایک منظم اور مستقل تعلیمی رہنمائی کا پروگرام رائج ہوگا تاکہ بچوں کی زندگیوں کو صحیح ڈگر پر چلایا جا سکے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشی رہنمائی

تعلیمی رہنمائی کی ایک اور شکل بھی ہے جسے طریقِ معاش کے متعلق رہنمائی Career Guidance کہا جاتا ہے جو جدید نظامِ تعلیم کا ایک ضروری جزو ہے۔ ایسا نظامِ تعلیم جو بچوں کو آئندہ چل کر روزی کما کر کھانے کے قابل نہیں بنا سکتا فی زمانہ بیکار ہے۔ اس رہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ اساتذہ اہلیتی آزمائشوں (Aptitude Tests) سے واقف ہوں۔ انہیں ذہنی آزمائشوں کا استعمال آتا ہو اور اُن کے سکور (Score) سے مزید نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ایسی تکنیکی تربیت کی تمام تر ذمہ داری صرف اساتذہ کے سر نہیں بلکہ اسکولوں پر بھی ہے کہ وہ ''دورانِ ملازمت کورسوں'' کے ذریعے اساتذہ کو یہ فن سکھا دیں تا کہ وہ صحیح انداز میں بچوں کی رہنمائی کر سکیں کہ وہ کسی قسم کے کام یا پیشہ کے اہل ہیں۔ تعلیمی رہنمائی اور معاشی رہنمائی کے ابتدائی ریکارڈ بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔ تین چار سال کے ریکارڈوں کے گہرے مطالعے، اساتذہ کے باہمی مشورے اور والدین کے تبادلہء خیالات کے بعد ان خطوط کا تعین ہو سکتا ہے۔ جن پر آئندہ کسی بچے کو چلنا ہے۔

کلینیکل رہنمائی

کلینیکل رہنمائی سے مراد غیر معمولی کردار کے بارے میں ایسا فنی مشورہ ہے جو صرف ماہرینِ نفسیات دے سکتے ہیں جنہوں نے اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ ممکن ہے بہت عرصے تک ہم اپنے سکولوں میں ایسے مرکز جاری نہ کر سکیں جہاں بچوں کے غیر معمولی کردار، ذہنی اور تعلیمی پسماندگی، اکتسابِ علم میں غیر معمولی سُست کوشی، بے سبب خوف، تنہائی پسندی، چڑچڑاپن، بے وجہ چیزوں کو توڑنے کی عادت، چوری کرنا، جھوٹ بولنا اور اس قبیل کے دوسرے افعال و کردار کا مطالعہ کر کے بچوں کی مدد کر سکیں تا کہ وہ عام بچوں کی طرح صحت مند، باسلیقہ اور سماجی طور پر کار آمد بن جائیں۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر سکول میں چند منتخب اساتذہ کو اس کام کے کرنے کا بیڑا اُٹھانا ہوگا کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ظاہر ہے کہ قوم کے وہ بچے جن کی کچھ ذاتی مشکلات یا مسائل ہیں، زندگی کے موقع سے بہرہ اندوز ہونے سے محروم رہ جائیں گے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بگڑے والدین

شہزاد احمد

بگڑے بچے (Spoiled Children) خودرو پودے نہیں ہیں جو برسات کی نمی سے خود بخود جنم لے لیتے ہوں، بلکہ والدین باقاعدہ طور پر بچوں کی تربیت اس طریق سے کرتے ہیں کہ ان کے لئے ’بگڑا بچہ‘ بننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ یہ کوشش اکثر حالتوں میں لاشعوری اور بعض حالتوں میں شعوری بھی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بگڑے والدین، بگڑے بچوں کو جنم دیتے ہیں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ بگڑا بچہ نفسیاتی طور پر صحت مند والدین کے گھر پیدا ہوا ہو۔

اگر والدین کے کردار کا تجزیہ کیا جائے تو بگڑا بچہ اس کی قدرتی پیداوار معلوم ہوگا۔ اس طرح جہاں ہمارے ہاں ’’بگڑے بچے‘‘ کی اصطلاح موجود ہے اور ہم اسے بے دھڑک مگر بجا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ والدین کے سلسلے میں بھی ہونا چاہئے۔ آخر بگڑے بچے جنم دینے والوں کو ہم کس نام سے یاد کریں گے۔ اصول اس کا بہت سیدھا سادہ ہے اگر بگڑے بچوں کی اصطلاح موجود ہے تو بگڑے والدین کی اصطلاح بھی رائج ہونی چاہئے تاکہ بچے اور والدین ایک دوسرے کے کرداری وجود کو ثابت کرسکیں۔

انسانی بنیادی خواص میں شاید ہی کوئی خاصیت ایسی ہو جسے محض بزرگی کے ساتھ متعلق کہا جا سکے۔ جہاں تک بنیادی انسانی خواص کا تعلق ہے، بچہ مکمل انسان ہے، اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو انسان کو انسان بناتی ہیں۔ بلکہ افلاطون کے خیال میں تو وہ بزرگوں سے کہیں زیادہ بہتر بھی ہے۔ مگر یہ مفروضہ خاصہ دُور از کار ہے اور عملی زندگی میں اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچہ پیدائش کے وقت ہی سارے بنیادی خواص لے کر آتا ہے۔ مگر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے وہ اپنی صلاحیتوں میں سے چند ایک کو بروئے کار لاتا ہے۔ سب بنیادی صلاحیتوں کو یکساں طور پر ترقی دینا ممکن نہیں۔ شخصیت کی تشکیل کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس میں بعض قابلیتیں بنیادی حیثیت اختیار کر چکی ہوں اور باقیوں کا درجہ ثانوی ہو گیا ہو۔ چنانچہ اس طریق سے شخصیت متشکل ہوتی ہے، ہر انسانی کردار میں بعض خصوصیات نمایاں اور باقی مخفی ہوتی ہیں۔ مگر بچہ اپنے کردار کی تشکیل اس عمر میں شروع کر دیتا ہے جبکہ وہ ابھی بُرے بھلے میں تمیز کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اسی لئے تحلیلِ نفسی بیشتر مریضوں کے علاج کے لئے زندگی کے اوّلیں حصے تک رسائی حاصل کرنے کو ضروری خیال کرتی ہے کیونکہ یہی وہ منبع ہے جس سے ہر طرح کا کردار پھوٹ سکتا ہے۔ چنانچہ تحلیلِ نفسی کے تعارف کے بعد بچپن کی ذہنی حالت اس قدر اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

اڈلر نے بچپن کی یادداشت اور تشکیلِ کردار میں بڑا گہرا رابطہ دریافت کیا ہے۔ اس رابطے کی نوعیت فرائیڈ کے دریافت کردہ رابطے سے قدرے مختلف ہے۔ اڈلر کا طریق کار کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ اپنے مریضوں سے ان کی زندگی کی پہلی یادداشت کے بارے میں سوال کرتا ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون سا واقعہ ہے جو مریض کے ذہن نے خاص طور پر محفوظ کر رکھا ہے۔ یہی واقعہ کردار کا مرکزی نکتہ ہے جس سے افعال کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے زندگی کی پہلی یادداشت ایسے کردار کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہو جو غیر صحت مند ہے تو تحلیل نفسی کی مدد لینی ضروری ہو جاتی ہے۔ اڈلر یہ سمجھتا ہے کہ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی مطمحِ نظر ضرور ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی غیر واضح اور مبہم کیوں نہ ہو۔ اس مدرسہ ءخیال کے نزدیک انسانی کردار میں اتنی دیر تک کوئی اہم تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی جب تک اس مطمحِ نظر کو بنیادی طور پر کسی نہ کسی حد تک تبدیل نہ کر دیا جائے۔ مطمحِ نظر کے سراغ کا ایک موثر طریقہ "انفرادی نفسیات" کے مدرسہ ءخیال کے ہاں پہلی یادداشت بھی ہے، یا دوسرے لفظوں میں پہلی یادداشت یا بچپن کا اوّلیں دور مطمحِ نظر کی تشکیل کرتا ہے اور اس طرح سارے کا سارا انسانی کردار بچپن کے اوّلیں دنوں سے متعلق ہو جاتا ہے۔

اڈلر کے اس نظریے سے بچپن کی زندگی کی نفسیاتی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اصولی طور پر فرائیڈ کا معاملہ بھی اس سلسلے میں اڈلر سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جہاں تک انسانی کردار پر بچپن کی اثر اندازی کا تعلق ہے، فرائیڈ اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتا ہے۔ بلکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حقیقت تو یہ ہے کہ اس نکتے کی صحیح اہمیت دریافت کرنے والا فرائیڈ ہی ہے۔ مگر اڈلر کی توجیہات اس سے کافی مختلف ہیں۔ اس کی ابتدائی دور کی نفسیات کا جھکاؤ جنس کی طرف تھا۔ اس دور میں فرائیڈ نے انسانی کردار کے بیشتر عوامل کو جنس ہی کے نکتہءِ نظر سے دیکھا۔ مگر جنس کی اصطلاح کے معنی فرائیڈ کے ہاں اتنے محدود نہیں ہیں جتنے عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے نظریہءِ جنس میں تقریباً تمام کے تمام انسان جذباتی عوامل شامل ہو جاتے ہیں۔ جذبات کی حالت شروع شروع میں خاصی غیر متعلق ہوتی ہے۔ اس کی مثال دریا میں بہتے ہوئے گھاس کے ان تنکوں کی سی ہے جو بغیر کسی رکاوٹ کے دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں، لیکن اگر راستے میں ذرا سی کوئی چیز آ جائے تو گھاس کے تنکے اس سے چمٹ جاتے ہیں، دریا اسی طرح بہتا رہتا ہے مگر گھاس کے تنکے اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔

بچے کے جذبات بھی ابتدائی ایام میں آزاد رَو ہوتے ہیں، مگر جو لوگ بھی شروع شروع میں بچے کے قریب ہوں، بچہ اپنے جذبات انہی سے متعلق کر لیتا ہے۔ اس طرح بچے کے منفی اور مثبت دونوں طرح کے جذبات کا ایک رخ بن جاتا ہے جو عام طور پر والدین ہی سے متعلق ہوتا ہے، بچہ چونکہ اپنے طور پر بُرے بھلے کا فیصلہ ابتدائی ایام میں نہیں کر سکتا، اس لئے وہ والدین کی نقالی پر اُتر آتا ہے، کیونکہ والدین ہی وہ ہستیاں ہیں جو بچپن میں بچے کے قریب ترین ہوتی ہیں اور بچے کے ہر طرح کے جذبات انہیں سے متعلق ہوتے ہیں۔ پھر وہ تتبع بھی والدین ہی کا کرتا ہے۔ یعنی والدین کی حیثیت ایک طرح کے مثالی کردار کی سی ہو جاتی ہے۔ بچہ نہ صرف والدین کی اچھائیوں ہی کو قبول کرتا ہے بلکہ سارے کا سارا کردار اپنانا چاہتا ہے، اس لئے بچپن میں ذہنی تشکیل کی زیادہ تر ذمے داری والدین ہی پر آنی چاہئے۔

بچہ شروع شروع میں ایک غیر متشکل شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے یا دوسرے لفظوں میں وہ معاشرے کا خام مال ہے جسے بعد میں شکل دی جاتی ہے، مگر خام خاصیتوں سے عاری نہیں ہوتا۔ ہر خام مال کو ہر شکل نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ بچے کے سلسلے میں کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت اس کے طبعی رجحانات کو پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اکثر والدین اپنے فیصلے بچوں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح وہ ان خواہشات کو بھی پورا کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کے اندر نا آسودہ رہ گئی ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ بچے کا ذہن ہر چیز کو اسی طرح قبول کرے جس

www.iqbalkalmati.blogspot.com: مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرح والدین کی خواہش ہو۔ کرداریت (Behaviourism) کے مدرسہء خیال کے علمبردار واٹسن نے کہا تھا کہ تجرباتی طور پر میں کسی بھی بچے کو جو بنانا چاہوں، بنا سکتا ہوں۔ مگر عملی طور پر اس مفروضے کو درست ثابت کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ بچے کو سائنس کی لیبارٹری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ بچے کا ذہن جیتی جاگتی چیز ہے جو کسی حالت میں بھی اپنے آپ کو والدین یا ماہرِ نفسیات کے بتائے ہوئے راستے تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ بچہ اپنے اردگرد سے کیا تاثرات قبول کرتا ہے، ہم اندازہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس عمل کو روکا جا سکتا ہے۔

خود بڑے بھی بیرونی اثرات کو غیر محسوس طور پر قبول کرتے رہتے ہیں اور یہ اثرات ان کی شخصیت پر خاصا گہرا اثر بھی ڈالتے ہیں۔ جب فرائیڈ نے تحلیلِ نفسی کو متعارف کرانا شروع کیا تھا تو لوگوں نے کہا تھا کہ تمہارے بہت سے نظریات شوپنہار اور نطشے سے ملتے جلتے ہیں۔ فرائیڈ نے اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا میں نے ان کا مطالعہ سرے سے کیا ہی نہیں۔ فرائیڈ اس وقت یہ فراموش کر رہا تھا کہ شوپنہار اور نطشے کے اثرات محض ان کتابوں تک محدود نہیں بلکہ جیتی جاگتی زندگی کا ضروری حصہ بن چکے ہیں اور وہ غیر محسوس طور پر ان سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ بعد میں فرائیڈ نے عملی طور پر ان کا مطالعہ کیا اور باقی عمر ان سے افادہ کرتا رہا۔

چنانچہ والدین ایک حد تک ہی بچے کی ذہنی نشوونما کے ذمے دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں، مگر وہ بچے کو ایسے راستے پر ضرور ڈال سکتے ہیں جو صحت مندی کی طرف جاتا ہو، راستے پر ڈالنے کا مطلب کڑی نگرانی نہیں ہونا چاہیے۔ جو والدین بچے پر کڑی نگرانی شروع کر دیں اور بچوں سے ایسا سلوک کریں جو ڈکٹیٹر جنگ کے دنوں میں اپنی رعایا سے کرتا ہے تو بچے کے ذہن میں بغاوت پوری طرح اُبھر سکتی ہے۔ اس بغاوت کو اڈلر نے مردانہ احتجاج (Masculine Protest) اور فرائیڈ نے ضبط ایڈیپس کا نام دیا ہے۔ چنانچہ بگڑے والدین کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ بچے کی شخصیت کو تسلیم نہ کریں، بلکہ اسے کٹ پتلی سمجھنا شروع کر دیں۔ ایسے حالات میں بچے کی نشوونما صحت مند طریقے سے نہیں کی جا سکتی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ والدین بچے کی زندگی سے اس حد تک غیر متعلق ہو جائیں کہ وہ اس میں ضروری دلچسپی لینا بھی چھوڑ دیں۔ ایسی حالت میں بچے کی افزائش خود رو جھاڑی کی سی ہو جاتی ہے۔ چمن آرائی کے لیے پودوں کی تراش خراش کی اشد ضرورت ہے ورنہ جو پودا نمو حاصل کرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گا وہ بے ڈھنگا اور بے تکا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بچہ جس کی نشوونما مندرجہ بالا طریق سے ہو ہم اسے بگڑا بچہ کہتے ہیں، مگر وہ والدین جو اپنے بچوں کی پرورش اس طریق سے کریں کیا وہ بگڑے والدین نہیں ہیں۔ بچوں کے کردار پر ضرورت سے زیادہ کڑی نگرانی اور بے پروائی دونوں مضر ہیں، کیونکہ دونوں حالتوں میں بچے کی شخصی اہمیت سے انکار کیا جاتا ہے۔ پہلی صورت میں بچے کو اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی اجازت ہی نہیں دی جاتی۔ جس سے اس کی فیصلہ کرنے کی قوت بُری طرح متاثر ہونے کا احتمال ہے۔ دوسری صورت میں بچے والدین کی محبت بھری نگرانی اور رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں جس سے ان کی شخصیت غیر صحت مند ہو سکتی ہے اور وہ معاشرے کے اچھے رکن نہیں بن سکتے۔ ہر بچہ ایک جیتا جاگتا مسئلہ ہے جسے خاصی احتیاط سے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے مگر اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا بھی درست نہیں کہ انسان چلنا ہی چھوڑ دے۔

عام طور پر والدین بچوں کے مسائل کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جو کچھ انہیں پہلے پہل سمجھ میں نہیں بھی آتا اسے دوستی اور ہمدردی کے ساتھ آخر کار حل کر لیتے ہیں۔ اسی لئے اکثر اوقات بچے بگڑے بچے نہیں بنتے اور بغیر کسی شعوری کوشش یا علمی جدوجہد کے ان کی پرورش اور تعلیم کا عمل جاری رہتا ہے۔ مگر جب حالات بگڑنے لگیں تو محض اس وقت ہمیں ماہرِ نفسیات کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب تک انسان بیمار نہ ہو وہ طبیب کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ اسی طرح بچوں کی نفسیات انہیں والدین کے لئے کارآمد ہے جو بچوں کی پرورش نارمل انداز سے نہیں کر سکتے۔ بچوں کی نفسیات پر آجکل بے شمار اَدب بازار میں بِک رہا ہے۔ ان کتابوں اور رسالوں کا وجود ایک طرف تو ہماری علمی ترقی کو ثابت کرتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ بچے اَب ہمارے لئے مسئلے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ تہذیبی ترقی نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ اَب ہم بچوں کے مسائل پر ہمدردانہ غور کے متمنی ہیں، مگر اس کے ساتھ خاندانی بندھن، جو پہلے بہت زیادہ مضبوط تھے اَب خاصے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ صنعتی ترقی اور بڑے بڑے شہروں کی پیدائش نے ہمارے معاشرے کی اندرونی مضبوطی کو بُری طرح متاثر کیا ہے، مصروفیات کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہو گئی ہے کہ کم از کم ترقی یافتہ طبقہ کے گھروں میں بچوں کی نگہداشت کا کام گھریلو ملازم یا غیر ملکی آیا کرتی ہے۔ جب بچے قدرے بڑے ہو جائیں تو ان کو کسی انگریزی سکول کے ہوسٹل میں داخل کروا دیا جاتا ہے اور والدین بچے سے اس طرح ملتے ہیں جیسے کسی مہمان سے ملاقات کی جاتی ہے۔ بچے پر کچھ سو روپلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماہوار خرچ کرنے کے بعد والدین کا فرض پورا ہو جاتا ہے۔ مگر بچہ والدین کی خصوصی توجہ چاہتا ہے جو اسے نہیں ملتی، چنانچہ بچے کی جذباتی زندگی مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری طرف وہ والدین ہیں جن کے ذرائع محدود ہیں مگر کچھ نہ کچھ وقت اپنے گھر میں بچوں کے درمیان گزار سکتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں اولاد اس قدر ہو جاتی ہے کہ وہ کسی پر خصوصی توجہ مرکوز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ سارے کے سارے بچے والدین کی شفقت اور محبت سے محروم رہ جاتے ہیں، جن بچوں کو بچپن ہی میں والدین کی محبت نہ ملی ہو وہ بڑے ہو کر زندگی کی اعلیٰ اقدار پر اعتماد نہیں رکھ سکتے۔ ایسے لوگوں کا مجرمانہ ذہنیت کا حامل ہو جانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔

اسی لئے بگڑے بچوں کا مسئلہ دراصل بگڑے والدین کا مسئلہ ہے۔ بگڑے والدین محض بچے کے طبعی والدین نہیں ہیں بلکہ سارا معاشرہ والدین ہی کے زُمرے میں آتا ہے۔ کیونکہ ہر نسل اپنی خوبیاں اور برائیاں آنے والی نسل کے حوالے کر کے رخصت ہو جاتی ہے۔ ہماری آئندہ نسل کی ہلکی سی جھلک ہماری موجودہ نسل میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر آپ اپنے معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو اس کا عمل جہاں سست رفتار ہوتا ہے وہیں فوری بھی ہونا چاہئے تاکہ بچوں کی تربیت صحیح طور پر کی جا سکے اور آئندہ نسلیں ان بُرے اثرات سے بچ جائیں جو ہم نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کئے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بگڑے بچے

مظفر احمد قریشی

ہر انسان کا نظریہ زندگی اس کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔اور یہ عکس اُس قوتِ ارادی کی کمی بیشی کا اظہار ہے جو انسان کی شخصیت کا موجب بنتی ہے۔یہ وہ قوت ہے جو انسان کو حیوانات کی کڑی میں اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی ہے۔جس کے ذریعے یہ اپنے ماحول کی گوناگوں کیفیتوں پر اپنی حسب منشاء قابو پا سکتا ہے اور زندگی کی موسیقی کو قائم رکھنے کے لئے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے۔جن لوگوں میں یہ ''ذہنی لچک'' زیادہ ہوتی ہے اُن کے لئے زندگی ایک خوشگوار حقیقت بن جاتی ہے اور ہر مسئلہ زندگی ایک کھیل کی طرح ہوتا ہے جس کی مشکل پر عبور پانا ان کے لئے باعث مسرت بن جاتا ہے۔

اس طرح ہر کامیابی اُن کی اس قوت کو زیادہ سے زیادہ کرتی چلی جاتی ہے اور ہر ناکامی ان کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے۔جس کا جواب وہ اپنی پوری طاقت سے دیتے ہوئے فتح حاصل کرتے ہیں اور یوں زندگی کی مشکلات اُن کی کامیابی کا راز بن جاتی ہیں۔وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔وہ زندگی بھر ہنستے کھیلتے رہتے ہیں اور آخری وقت آنے پر بغیر کسی خوف کے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ایسے لوگ زندگی میں موت سے کبھی نہیں ڈرتے۔یہ زندگی کو زندگی سمجھتے ہوئے زندہ رہتے ہیں اور موت کو موت سمجھتے ہوئے مر جاتے ہیں۔زندگی اور موت اُن کے لئے دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ایک کا دوسرے میں کوئی دخل نہیں۔وہ زندگی میں موت کے خوف سے ہزاروں مرتبہ زندہ رہنے کی تمنا میں مرنے کی بجائے صرف ایک دفعہ مرتے ہیں اور اس وقت جب اُن کے لمحاتِ زندگی پورے ہو جاتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم اکثر حقیقت کی ترجمانی اپنے ابتدائی ماحول کی تربیت کے مطابق کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی حقیقت کو مختلف رنگوں میں دیکھتے ہیں اور یہ رنگ ابتدائی ماحول کی تربیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ہم زندگی میں بار بار کوشش کرنے کے باوجود ناکام رہتے ہیں۔ ہمیں ایسے آدمی بہت ملیں گے جو زندگی میں ناکام رہے ہے۔ ایک دفعہ اُن کے قدم ایسے اُکھڑے کہ پھر جم نہ سکے۔ ناکامی کے بعد ناکامی، مصیبت کے بعد مصیبت ان کے سر پر سوار رہی۔ محض اس لئے کہ اُن کی شخصیت کی بنیاد ایک ایسی تربیت پر رکھی گئی جس نے اُن کے اندر ذہنی کش مکش پیدا کر دی۔ یہ کش مکش دیمک کی طرح اُن کی قوتِ حیات کو چاٹ لیتی ہے اور اُن میں اتنی طاقت نہیں رہتی کہ وہ دنیاوی اُلجھنوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ اگر کبھی وہ اُس پر قابو پانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو ابتدائی ماحول کے اثرات کی وجہ سے حقیقت کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اصلیت کو اپنے بچپن کے ماحول کی عینک سے دیکھتے ہیں جسے اُن کی ابتدائی تربیت نے ایک مخصوص رنگ دے رکھا تھا۔ اس غلط ترجمانی کی وجہ سے اُن کی وہ تھوڑی سی طاقت بھی کوئی پھل نہیں لا سکتی۔ وہ اس مسلسل ناکامی سے اتنے ڈرتے ہیں کہ آخر اسی میں ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا بچپن ایک ہنگامہ خیز زمانہ تھا جس میں اُن کی اندرونی اور بیرونی جذباتی کشمکش نے ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اس رَو میں وہ بے دست و پا اس طرح بہتے چلے گئے کہ کہیں کنارہ نہ مل سکا۔ اُس جذباتی تسکین کے لئے جو اُن کا پیدائشی حق تھا انہوں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن اِن بدقسمت روحوں کو وہ کبھی میسر نہ آ سکی۔ اس ناکامی نے اُن کے اندر ایک ایسا انتقامی جذبہ پیدا کر دیا جو اُن کی اُن تمام حرکات کا موجب بنا جس کی بنا پر پہلے والدین نے اُن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر سوسائٹی نے۔ اس طرح دونوں نے مل کر اُن کو ''بگڑے بچوں'' کا خطاب دیا۔

بگڑے بچے والدین کے لئے وبالِ جان ہوتے ہیں۔ والدین ایسے بچے کو سدھارنے کی غرض سے اکثر گالیوں (جو بہت بلند آواز میں دی جاتی ہیں) تھپڑ، مُکّے، جُوتے اور ڈنڈے کے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ ''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے'' ــــــ یہ اُصول ان کی بُری عادت کا علاج ٹھہرایا جاتا ہے۔ مثلاً ضد کا علاج ــــــ بچے کو مارنا، بھوکا رکھنا، اور زیادہ تنگ کرنے پر کمرے میں بند کر دینا وغیرہ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر بچہ سکول جانے کی عمر کا ہو تو اُس کو سکول داخل کر دینے کی دھمکی دی جاتی ہے اور بڑے زور کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ وہاں ماسٹر اس کو خوب پیٹا کرے گا اور لڑکے اُس کا خوب مذاق اُڑائیں گے۔ لیکن جلد ہی وہ وقت بھی آ جاتا ہے جبکہ اُسے سکول میں واقعی داخل کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ یہ سمجھتا ہے کہ سکول ایک سزا خانہ ہے۔ جس میں اس کو بُری عادات کی وجہ سے داخل کیا گیا ہے اور جہاں سزا کے ذریعے بچے کو صحیح عادات سکھائی جاتی ہیں۔ اس لئے سزا کا ملنا گویا ایک لازمی امر ہے۔ اب وہ سکول سے ڈرتا ہے۔ طرح طرح کے بہانے بناتا ہے۔ صبح کے وقت عموماً پیٹ درد شروع ہو جاتا ہے۔ یا کتاب گم جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ والدین جو خود اسی قسم کے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان بہانوں کو خوب سمجھتے ہوئے بچے کو مار پیٹ کر زبردستی سکول بھیجتے ہیں۔ اب بچہ جماعت میں خوف کے مارے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں ہوتا ہے کہ ابھی ماسٹر صاحب کا ڈنڈا سر پر پڑا۔ اس ڈر کی وجہ سے وہ اپنے سبق میں کوئی دلچسپی نہیں لے سکتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو سبق نہیں آتا اور سکول میں ہر روز مار پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ ب وہ اس سزا میں سے گزر رہا ہے جس کی دھمکی پہلے ہی اُسے دی گئی تھی۔ اب وہ سکول جانے سے نکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ انکار اُس کے والدین کے غصے کو پہلے سے بھی زیادہ بھڑکا دیتا ہے۔ اور س کو بہت بُری طرح سے پیٹا جاتا ہے۔ اب بچے کو دونوں طرف سے موت دکھائی دیتی ہے۔ یک آفت میں جان آ جاتی ہے۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ سکول جائے تو استاد مارتا ہے، گھر رہے تو ماں باپ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اب وہ سکول جانے کی بجائے اِدھر اُدھر دن گزار کر چھٹی کے وقت گھر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ بھی زیادہ دیر نہیں چلتا۔ باپ کو پتہ چلتا ہے تو پہلے سے بھی زیادہ سزا دی جاتی ہے اور سکول جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔ بیماری کی حالت میں والدین بچے کی ہر خواہش پورا کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں اور سب سے بڑا یہ کہ سکول نہیں بھیجتے۔ اس طرح بیماری بچے کے لئے رحمت بن کر آتی ہے۔ بچہ والدین کی محبت حاصل کر لیتا ہے جس کے لئے وہ آج تک ترس رہا تھا۔ اگر بچے کی تمام خواہشات بیماری کی حالت میں ہی پوری ہوتی رہیں تو وہ غیر شعوری طور پر بیمار رہنے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح سے اس کو سکول سے بھی چھٹکارا مل جاتا ہے اور گھر میں بھی والدین پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر بچہ بیمار نہ ہو تو بھی مار کا خوف اُس کی ننھی سی روح پر اس طرح غالب رہتا ہے کہ اگر وہ پڑھنا بھی چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔ پڑھنے کے نام سے ہی اُس کا ذہن کند ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ انسان جذباتی ہونے کی وجہ سے اکثر غلطی کرتا ہے۔ جس کا احساس جذبات کے ٹھنڈا ہونے پر ہی ہوتا ہے۔ جذبات کی رو میں انسان کا دماغ بالکل کام نہیں کرتا۔ لیکن ہم بچے کی اس جذباتی بے بسی کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہوئے اُس پر یہ فتویٰ لگاتے ہیں کہ وہ کند ذہن ہے اور بالکل آوارہ۔

دراصل خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اُس کے جذبات میں ایک ہیجان سا برپا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کا دماغ کام کرنے سے بالکل عاری ہو جاتا ہے جس مضمون کے پڑھنے پر بچے کو زیادہ پیٹا گیا ہو۔ وہ اُس میں کبھی دلچسپی نہیں لے گا اور ہمیشہ کمزور رہے گا، اور جس سبق کے بھولنے پر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سمجھا دیا گیا ہو اس میں زیادہ دلچسپی لے گا شوق سے پڑھے گا اور ہمیشہ ہوشیار رہے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکا ایک مضمون میں ہمیشہ اوّل آتا ہے لیکن دوسرے میں ہمیشہ فیل ہوتا ہے۔ اس ناکامی کی وجہ سوائے مار کے خوف کے جو اُس مضمون کے ساتھ وابستہ ہے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اگر کند ذہن ہوتا تو کبھی بھی ایک مضمون میں اتنا اچھا نہ ہوتا کہ جماعت میں اوّل آتا۔ لیکن والدین ان باتوں کو نہ سمجھتے ہوئے بچے کے ساتھ سختی کو برابر جاری رکھتے ہیں اور اپنے احکام کی پیروی بچے کو خوفزدہ کر کے کروانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ان تمام کوششوں کے باوجود بچے کو سکول کی زندگی میں کامیاب نہ کروا سکیں تو تنگ آ کر اور ناامید ہو کر اس کو کوئی کام سیکھنے بھیج دیتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی اس کی وہی حالت رہتی ہے۔ وہ ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔ کام میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور پھر خوب پیٹا جاتا ہے اور تنگ آ کر کسی اور کام پر لگایا جاتا ہے۔ لیکن یہ بدل بھی کارگر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ اب وہ آوارہ بچہ ہے۔ ہر آدمی اُس کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو بچہ غیر شعوری طور پر کہتا ہے: ''اگر میں بُرا ہوں تو دنیا کو بُرا ہی بن کر دکھاؤں گا۔'' اب جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے ایک انتقامی جذبے کے ماتحت اپنے اندر غیر شعوری طور پر ہر قسم کی بُرائیاں پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جن کی بنیاد ابتدائی ماحول کی تربیت کے مطابق پہلے ہی رکھی جا چکی ہے۔

بعض بچوں میں چوری کی عادت پیدا ہو جاتی ہے وہ گھر سے پیسے چراتے ہیں اور باہر جا کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسی چیزوں پر خرچ کرتے ہیں۔ جن سے اُن کو ہمیشہ روکا گیا ہو۔ یا اِدھر اُدھر ضائع کر دیتے ہیں۔ ایسے چور بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو صرف خاص چیزوں کی چوری کرتے ہیں۔ مثلاً بجلی کے بلب، چاقو، رومال، عورتوں کے بٹوے وغیرہ۔ ولایت میں ایک ایسے چور کو سزا دی گئی جو کہ عورتوں کے رومال ہی چرایا کرتا تھا۔ جامہ تلاشی پر اُس کے قبضے سے بہت سے رومال نکلے۔ جن کو اُس نے اپنے لباس کی اندرونی پرتوں کے ساتھ سیا ہوا تھا۔ تا کہ وہ اُس کے جسم کے ساتھ مس کرتے رہیں۔ اسی قسم کے ایک اور چور کو سزا ملی جو چپکے سے عورتوں کے بالوں کی لٹیں کاٹ لیا کرتا تھا۔ اور ان کو بڑی حفاظت کے ساتھ دھاگے کی گچھیوں کی طرح علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں رکھا کرتا تھا۔ اور سونے سے پہلے ان سب کو ایک دفعہ ضرور دیکھتا۔ کئی چور ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ چوری کرتے پکڑے جاتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر وہ یہ حرکت اُس وقت کرتے ہیں جبکہ اُن کو کوئی دیکھ رہا ہو اور یہ چوری اکثر بالکل معمولی چیزوں کی ہوتی ہے۔ اس قسم کے چور عموماً امیر آدمیوں کے بچے ہوتے ہیں۔ جن کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ ایسی حرکات کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

بعض آوارہ بچے بڑے لڑاکے ہوتے ہیں۔ ان میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔ معمولی سی بات پر لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر خوب پٹتے ہیں۔ ماں باپ کے ساتھ اُن کی اکثر لڑائی رہتی ہے جس کی وجہ سے اُن کو چھوٹی عمر میں گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ باہر جا کر وہ بات بات پر لڑائی مول لیتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگوں کے ساتھ لڑتے ہیں جو کہ اُن سے عمر، امارت اور سماجی لحاظ سے بڑے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی میں کئی بار جیل جاتے ہیں۔ یا کسی کو جان سے مار ڈالنے پر پھانسی پاتے ہیں۔

اگر بچے کے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آیا جائے تو کئی دفعہ اُس میں ایسی عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو مندرجہ بالا عادات کے بالکل برعکس ہوتی ہیں۔ وہ بہت فرماں بردار بن جاتا ہے۔ جس کام کو کہا جائے فوراً کرتا ہے اور اپنے والدین کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ والدین کی معمولی سی ناراضگی اُس کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن جاتی ہے۔ اس طبیعت کے بچے اکثر خاموش رہتے ہیں۔ صرف اُس وقت بات کرتے ہیں جبکہ بہت ضروری ہو۔ دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتے۔ کسی سے لڑتے جھگڑتے بھی نہیں اور نہ ہی کبھی کسی چیز کے لئے ضد کرتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُن کی یہ بے تعلقی بڑھتی چلی جاتی ہے ساتھ ہی وہ اپنے اندر ایک ایسی دنیا بسا لیتے ہیں۔ جس میں وہ اپنی خواہشات کو با آسانی پورا کر سکتے ہیں۔ جس میں خوف اور انکار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جونہی اُن کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی پوری ہوگئی۔ اس خیالی دنیا میں وہ بہت ہی خوش رہتے ہیں۔ بیرونی دنیا اُن کے لئے خوف اور ناکامی کا ایک مجسمہ ہوتی ہے۔ جس میں سوائے دکھ اور درد کے کچھ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایک صحیح الدماغ انسان بھی عارضی طور پر اس قسم کی دنیاوی بے تعلقی پیدا کر کے خیالی دنیا میں پناہ لے لیتا ہے۔ جبکہ زندگی بہت تلخ ہو جاتی ہے اور باوجود انتہائی کوشش کے وہ اپنی مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا۔ لیکن جوں ہی زندگی کا تقاضا اُسے مجبور کرتا ہے کہ وہ دوبارہ اس دنیا سے رشتے کو قائم کرے، وہ اپنے غم سے جلد از جلد نجات پانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ پھر سے دنیا میں پہلے کی طرح ایک باعمل انسان بن جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی آہنی لچک ان جذباتی مریضوں میں نہیں ہوتی کہ وہ تکلیف کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی بیرونی دنیا کو خیالی دنیا پر ترجیح دے سکیں۔ اُن میں بچپن کے اندرونی خوف کی وجہ سے بیرونی دنیا سے لگاؤ آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ خیالی دنیا، اصلی دنیا کی جگہ لے لیتی ہے۔ بعد میں اُس سے نکلنے یا رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر اس مرض کو شروع میں ہی پکڑ لیا جائے تو تجزیہ نفس کے ذریعہ اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن مرض کے بڑھ جانے کے بعد اس کا علاج بہت لمبا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی مریض پاگل خانوں میں ہی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔

کئی بچوں میں وحشی پن اور انتہائی افسردگی باری باری نمایاں ہوتی ہے۔ پہلی حالت میں وہ سب سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ کسی کا کہنا نہیں مانتے۔ گھر میں طوفان مچا دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں سے اپنے حکم کی تعمیل کروانے کے لئے ہر قسم کے تشدد سے کام لیتے ہیں۔ لیکن ان کی دوسری حالت پہلی سے برعکس ہوتی ہے۔ وہ بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کے لئے تنگ نہیں کرتے۔ اگر کوئی اپنی بُری حرکت یاد آ جائے تو بہت پچھتاتے ہیں۔ والدین سے بار بار معافی مانگتے ہیں۔ اپنے آپ کو بہت ذلیل سمجھتے ہیں۔ خودکشی کا خیال بھی اُن کے ذہن میں اکثر آتا ہے۔ ان کی یہ دونوں کیفیتیں والدین کی سخت پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے نقطہ نظر سے ایسے مریض بھی اُس جذباتی کشمکش کا نتیجہ ہیں جو کہ والدین کی بدسلوکی کی وجہ سے اُن کے اندر پیدا ہوتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعض اوقات بچے معمولی چیزوں سے بھی ڈرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً بلی، کتا اور گھوڑے وغیرہ سے۔ یا ٹانگہ موٹر اور ریل گاڑی کی سواری سے۔ یا بازار کو عبور کرتے وقت کھلے میدانوں یا تنگ گلیوں میں سے گزرتے وقت یا معمولی کھلونوں سے مثلاً کپڑے کی گڑیا، چوہے اور دوسرے جانوروں سے۔ اس قسم کے خوف جن کو ''فوبیا'' کہا جاتا ہے دراصل اُن کے اندرونی خوف کا بیرونی اظہار ہوتے ہیں۔ جو ان کے اندر جذباتی کشمکش کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ بچوں کے اندر ابھی اتنا احساس پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ اندرونی اور بیرونی دنیا میں تمیز کر سکتے۔ اس لئے وہ اندرونی خوف کو بیرونی چیزوں پر چسپاں کر کے اور اُن سے گریز کرتے ہوئے اپنے اندرونی خوف سے نجات پانا چاہتے ہیں۔ اب وہ ان سے ڈرتے ہیں اور بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ لیکن والدین اُن کے ڈر کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوئے اکثر سزا دیتے ہیں۔ یا خود لطف اُٹھانے کی خاطر اُن کو چڑاتے ہیں۔

کئی بگڑے بچے چھوٹی عمر میں ہی سگریٹ یا دوسری منشی اشیاء استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ایسا ماحول پیدا کر لیتے ہیں جن میں ایسی چیزیں انہیں بآسانی میسر ہو سکیں۔ یہ ماحول اُن کے چال چلن کو بگاڑتا ہے اور وہ کئی قسم کی غلط کاریوں کا شکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب والدین اُن کے رویے سے تنگ آ کر پیٹتے ہیں تو بجائے سدھرنے کے وہ بالکل باغی ہو جاتے ہیں اور اکثر گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس طرح سے اُن میں کئی بد عادات کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے بچے بڑے ہونے پر اکثر اپنی آمدنی زیادہ تر منشیات اور زنانِ بازاری کی نذر کر دیتے ہیں۔

کئی بچوں کو جوا کھیلنے کی عادت پڑ جاتی ہے وہ اس غرض سے گھر سے پیسے چُراتے ہیں اور ہمیشہ پٹتے ہیں۔ آئندہ زندگی میں بھی یہ عادت کئی برائیوں کا موجب بنتی ہے۔ اسی سلسلے میں ہم گھوڑ دوڑ کے شائقین اور اُن سٹے کے بیوپاریوں کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ جو کہ لاکھوں کے کھیل کھیلتے ہیں محض اس لئے کہ ہار جیت میں اُن کو غیر شعوری طور پر ایک خاص قسم کا لطف آتا ہے۔ اور یہ لطف اُن کو اس قسم کا خطرہ مول لینے پر ہر وقت مجبور کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسی قسم کا جوا ہے جس پر حکومت کو یا خود ان کے ضمیر کو اعتراض نہیں ہوتا، اس لئے وہ بغیر کسی اندرونی یا بیرونی خوف کے اپنی عادت کو پورا کر سکتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس طرح یہ بچے والدین کے لئے ایک معمہ بنے رہے، جسے سلجھانے کے لئے کڑی سے کڑی سزا بھی کارگر نہ ہوسکی اور اخیر تنگ آ کر انہیں اُن کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا۔ اس خرابی کے ذمہ دار غیر شعوری طور پر والدین خود ہی تھے مگر وہ بچوں کی بدعادات کا حل اُن ہی میں ڈھونڈتے رہے اس فوبیائی بچے کی طرح جو اپنے اندرونی خوف کو بیرونی چیزوں سے گریز کر کے دُور کر لیتا ہے۔ انہوں نے بھی غیر شعوری طور پر اپنی بدعادات بچے پر چسپاں کر کے اس سے نفرت کی اور مسائل کا حل اپنے آندر دریافت کرنے کی بجائے بچے میں ہی تلاش کرتے رہے، اور اپنی جذباتی اُلجھنوں کی وجہ سے بچے کی آئندہ زندگی برباد کردی۔

جب یہ بچے اس ابتدائی ماحول کی تربیت کے ساتھ سماج میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ وہی سلوک شروع ہوگیا جو گھر میں ہوا کرتا تھا۔ والدین کی طرح سوسائٹی نے بھی اُن کو بہت بُرا سمجھا اور ان کی اندرونی کشمکش کو نہ سمجھتے ہوئے اور ان کی مجبوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جتنی سختی بھی ہوسکتی تھی، کی۔ حکومت نے ان کے لئے پولیس رکھی، عدالتیں کھولیں، جیل خانے بنوائے، اور اس طرح اُن کو سدھارنے کی ناکام کوشش میں تشدد سے کام لیا۔ اُن کے اندر خوف پیدا کر کے اُس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی جس کی جڑیں سماج کی تاریک لاشعوری گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے پیوست ہو چکی تھیں۔ لیکن سماج میں یہ جراٴت کہاں کہ اپنی کمزوریوں اور برائیوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو رفع کرے اور اُن بچوں کو صحیح تربیت دے جن پر آئندہ سوسائٹی کی تعمیر کی ذمہ داری ہے۔ حکومت ان کو سزا دیتے وقت یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی کہ ایسا انہوں نے کیوں کیا اور اُن کا صحیح علاج کیا ہوسکتا ہے؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اتنی سختی کے باوجود غنڈوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اگر ہم سوسائٹی سے پوچھیں کہ یہ لوگ بُرے کیوں ہیں؟ ان کو بُرا کس نے بنایا؟ تو کئی لوگ بھولے پن سے جواب دیں گے کہ یہ اُن کی بدقسمتی ہے۔ جو کسی کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ کوئی کسی کی تقدیر کو بدل نہیں سکتا۔ جو خدا کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ یہ بھی خدا کی شان ہے کہ اُس نے اچھے اور بُرے سب بنائے ہیں۔

کئی لوگ جن کو کچھ سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔ مسئلہ تقدیر اور تناسخ کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کا اچھا بُرا ہونا صرف اس کی وراثت پر موقوف ہوتا ہے۔ اگر باپ اچھا ہوگا تو لڑکا بھی قدرتی طور پر اچھا ہی نکلے گا۔ ایک بُرے آدمی کا بیٹا ہمیشہ بُرا ہی ہوگا۔ کیونکہ بُرائی اُس کے خون

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

میں ہے۔اُس کے اچھے بننے کا کوئی امکان نہیں۔لیکن ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ اچھے باپ کا بیٹا بُرا اور بُرے کا اچھا ہوتا ہے۔اگر کسی کی خصلت کا دارومدار اُس کی وراثت پر ہی ہوتا تو اس کو ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم وراثت کو کسی کی خصلت کا موجب قرار نہیں دے سکتے۔لیکن وراثت کا اُس جگہ دخل ضرور ہوتا ہے جہاں کہ اُس کی جسمانی اور ذہنی ساخت کا تعلق ہو۔کئی آدمی قدرتی طور پر بہت ذہین ہوتے ہیں اور دوسرے بہت کند ذہن بچے کو اچھا ماحول دے کر ذہین نہیں بنایا جا سکتا۔مگر اس کا اثر ضرور ہوگا کہ وہ اپنی عقل کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گا۔اگر ذہین بچے کی جذباتی نشوونما اچھی نہ ہو تو وہ اُس کُند ذہن سے بھی بُرا ہے۔کیونکہ وہ اپنی جذباتی کشمکش کی وجہ سے اس خداداد نعمت کا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اکثر تعلیم یافتہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی شخصیت کا انحصار صرف اس کے ماحول پر ہے۔اگر کسی کا ماحول تبدیل کر دیا جائے تو اُس کی خصلت بھی ساتھ ہی بدل جاتی ہے۔لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انسان کی شخصیت متحرک ہونے کی وجہ سے اپنی طبیعت کے مطابق خود ماحول ڈھونڈتی ہے اور نہ ملنے پر بنا لیتی ہے۔انسان کسی بے جان چیز کی طرح ساکن نہیں کہ جہاں اُس کو بٹھا دیا جائے بیٹھا رہے۔اُس کے اندر زندہ رہنے کی قوت ہے۔یہ قوت کئی قسم کے جذبات، خواہشات اور تمنائیں پیدا کرتی ہے۔جن کو پورا کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے۔چاہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھی ہو یا بُری۔اسی طرح بڑی عمر کا بچہ بھی اپنی متحرک شخصیت کی وجہ سے اپنی طبیعت کے مطابق ماحول ڈھونڈتا یا بناتا ہے۔

ماہرینِ نفسیات نے اپنے تجربات کی بنا پر یہ انکشاف کیا ہے کہ بچے کی طبیعت جو اُس کے ماحول کا چناؤ کرتی ہے اُس ابتدائی ماحول کی تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے جو بچے کو پہلے چھ سال کے اندر دی گئی ہو۔یعنی اس عمر میں بچہ ہر قسم کی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے جن کو عمر کے آئندہ مراحل میں وہ ظاہر کرتا رہے گا۔

اگر ہم کسی شخص کو سُدھارنے کی غرض سے اُس کا ماحول بدل دیں تو اُس کے کردار پر اس کا اثر ضرور ہوگا۔لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے بُرے سے اچھا بن جائے۔اس قسم کی تبدیلی اس کی بدعادات کو قطعی طور پر دُور نہیں کر سکتی، البتہ کسی حد تک دبا ضرور دیتی ہے، اور یہ عارضی اصلاح محض اس دباؤ کا اثر ہوتی ہے۔لیکن یہ دباؤ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔جب کبھی اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کوئی کمی واقعہ ہوئی یا اُس کی اکتسابی فطرت نے زور پکڑا، اصل طبیعت کسی نہ کسی روپ میں ضرور ظاہر ہوگی۔ اس لئے ہم کسی آدمی کا ماحول بدل کر اُس کے کردار کو نہیں بدل سکتے۔ اگر ہم اُس کی بدعادت کو پورے طور پر درست کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہم کو اصل سبب اس کے بچپن میں دریافت کرنا چاہئے۔ جس کو دور کرنے سے یہ عادت خود بخود دور ہو جائے گی۔ ان اسباب کو دور کرنا تجزیہ نفس کا کام ہے۔ اس طرح فرد کی نئے سرے سے تربیت کی جاتی ہے، اور اُس کی تمام جذباتی اُلجھنوں کو دور کیا جاتا ہے۔ اگر ہم بچے کے پہلے چھ سال کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھیں۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کا بُرا سلوک نہ کریں تا کہ کسی قسم کی جذباتی کشمکش پیدا نہ ہو۔ تو اُس میں یقیناً کوئی ایسی بدعادت پیدا نہیں ہو سکتی جو اُس کی آئندہ زندگی میں تکلیف کا باعث بنے۔

انسان اکیلا زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ رہنے کی قدرتی خواہش اُس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بیرونی دنیا کے ساتھ تعلق پیدا کرے۔ اس طرح تمام وہ چیزیں جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے اُس کے ماحول کا جزو بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ سب چیزیں مل کر اس کا ماحول بنتی ہیں، اور ماحول اُس کی شخصیت کی بنیاد رکھتا ہے۔

نومولود کو دنیا کی کسی چیز کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اپنا ماحول خود ہی ہوتا ہے۔ بچہ اپنی ماں کو بھی اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے ہیں اور ماں بچے کو خود سے الگ کرتی ہے، اُس کی عدم موجودگی کو محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اب ماں اُس کے جسم کا ایک جزو نہیں بلکہ بیرونی وجود ہے۔ اس طرح اُسے بیرونی دنیا کا احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب بھوک سے نڈھال ہو کر وہ روتا ہے تو ماں فوراً اُس کی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔ اس طرح ماں بیرونی دنیا کی وہ پہلی فرد ہے جو بچے کے ماحول میں داخل ہوتی ہے۔ اب بچہ اپنے اس محدود ماحول میں پرورش پانا شروع کرتا ہے۔ اب اس کی شخصیت کی تعمیر ماں کے رویے پر منحصر ہے۔ اگر ماں اُس کی جبلی ضروریات کو سمجھتے ہوئے وقت پر پورا کرے تو اُس کی نشوونما تسلی بخش ہوتی ہے۔ اگر کوتاہی کرے اور اُس کی ہر ضرورت کو رونے پر ہی پورا کیا جائے تو اُس کی جذباتی نشوونما میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ بچہ آئندہ ہر ضرورت کے احساس پر رونا چلانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ عادت بعض اوقات کافی عمر تک بچے کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

بچے کو ماں کے دودھ سے ہی غرض نہیں ہوتی۔ وہ ماں کے پیار کا بھی بھوکا ہوتا ہے۔ یہ پیار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُس کے اندر تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اُس کی جذباتی نشوونما تسلی بخش ہوتی ہے۔ اور اُس کے اندر کوئی ایسا خوف پیدا نہیں ہونے پاتا جو جذباتی ہیجان اور نشوونما میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اگر بچے کی ضروریات وقت پر پوری نہ کی جائیں اور پیار کی بجائے جھڑکا اور مارا جائے تو احساسِ تحفظ کی بجائے اس میں ڈر پیدا ہوگا۔ اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ بچہ ہر وقت روتا چلّاتا رہتا ہے۔ والدین اس کی اندرونی کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے اُس کی بد عادت سے تنگ آ کر جب زیادہ خفا ہوتے ہیں تو اُس کا اندرونی خوف اور بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ یہ سمجھتا ہے کہ والدین بجائے محبت کے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ اسے ہمیشہ کے لئے کہیں چھوڑ نہ دیں۔ اس اندرونی خطرے کو دُور کرنے یا غلط ثابت کرنے کے لئے بچہ کوشش کرتا ہے کہ وہ ہر وقت ماں کی گود میں ہی رہے۔ اگر ذرا سی دیر کے لئے اتارا بھی جائے تو وہ چلّانا شروع کر دیتا ہے۔ اگر ماں تھوڑی دیر کے لئے اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو وہ بے بنیاد اندرونی خوف کی وجہ سے بے ساختہ چلّانا شروع کر دے گا۔ دراصل بچہ مستقل اور عارضی جدائی میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ سمجھتا ہے کہ ماں جو اُس کی زندگی کا سہارا ہے، اُس سے تنگ آ کر ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس بے بسی کے عالم میں اپنے آپ کو سخت غیر محفوظ سمجھتے ہوئے روتا ہے۔ لیکن ماں اُس کی جذباتی کیفیت کو نہ سمجھتے ہوئے اُس کو اُلٹا جھڑکتی اور مارتی ہے۔ بچہ کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن ماں کا ہر سلوک اُس کی اندرونی کشمکش اور خوف میں اضافہ کرتا ہے۔ بچہ اپنے طفلانہ طریقوں سے جس محبت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اُس سے دور دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ خرابی آئندہ زندگی میں کئی جذباتی بیماریوں کا موجب بنتی ہے۔

بچے میں پیار کی قدرتی طلب ماں کے بعد باپ کو اس کے ماحول میں لاتی ہے۔ بچہ چاہتا ہے کہ باپ اُس کے ساتھ کھیلے اور پیار کرے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے گھر کے دوسرے افراد بھی جو کہ اُس کو پیار کرتے ہیں، اس کے ماحول میں داخل ہوتے ہیں۔ اس طرح بچے کا ماحول بتدریج وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اب اس ماحول اور بچے کے باہمی تعلقات سے اُس کی شخصیت کی تعمیر ہوگی۔ اگر ماحول بچے کی فطرتی ضروریات اور خواہشات کو وقت پر اور مناسب مقدار میں پورا کرتا چلا گیا تو اس کا اثر بچے کی شخصیت پر بہت اچھا ہوگا۔ اگر اس میں کسی قسم کی ناجائز رکاوٹ پیدا ہوئی تو اس کا اثر بچے کی جذباتی نشوونما پر یقیناً بُرا پڑے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچہ صرف زندہ رہنے کی خاطر دودھ نہیں پیتا بلکہ دودھ پینے اور چوسنے میں بھی اسے بہت لطف آتا ہے۔ لذت کی یہ طلب اور بھوک دونوں مل کر بچے کو تھوڑی دیر کے بعد دودھ چوسنے پر اُکساتی ہیں۔ چوسنے کی لذت کی خاطر بچے اکثر مقدار سے زیادہ دودھ پی جاتے ہیں۔ جسے وہ بعد میں نکالتے رہتے ہیں۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بچہ سیر ہو کر دودھ پینے کے بعد بھی ماں کے پستان کو منہ سے نکالنا نہیں چاہتا۔ اگر نکال دیا جائے تو رونا شروع کر دیتا ہے۔ انگوٹھا یا جو چیز بھی اُس کے ہاتھ میں آئے منہ میں ڈال کر چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ دودھ پیتے وقت جب ماں کا پستان اور پیٹ کا کچھ حصہ بچے کے جسم کے ساتھ مس ہوتا ہے تو وہ ماں کے جسم کی حرارت کو محسوس کرتے ہوئے ایک خاص قسم کی تسکین، مسرت اور تحفظ محسوس کرتا ہے۔ یہ احساسات جذباتی سکون پیدا کرتے اور اسے گہری نیند سُلا دیتے ہیں۔ ایک مطمئن بچہ ہمیشہ دودھ پینے کے بعد سو جائے گا یا کھیلنا شروع کر دے گا۔ اگر والدین کا برتاؤ بچے کے ساتھ ایسا ہی رہے تو بچپن میں اُس کے اندر کسی قسم کی جذباتی کشمکش پیدا نہ ہو، اور والدین کو وہ بالکل تنگ نہ کرے۔ ایسا بچہ آئندہ زندگی میں بھی خوش رہے گا اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔ وہ سخی، علم دوست، غمگسار اور ہمدرد ثابت ہوگا۔

جن بچوں کو ماں کا دودھ نصیب نہیں ہوتا یا بہت کم عرصہ ملتا ہے ان کی جذباتی نشوونما اچھی طرح نہیں ہوتی۔ ان کو بڑی عمر میں بھی غیر شعوری طور پر ماں کے پیار کی حسرت رہتی ہے۔ جس کو وہ بعض غیر معمولی عادات سے پورا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش ان کی اندرونی کشمکش اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ اس قسم کے بچے آئندہ زندگی میں بالعموم مزاج کے خشک اور سنجیدہ ہوتے ہیں، اور ان میں قنوطیت بہت نمایاں ہوتی ہے۔ حسد اور عداوت کی خُو ان میں بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہمدردی کا جذبہ ان میں بالکل نہیں ہوتا۔ ان حقائق سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جذباتی صحت کے لئے ماں کا دودھ کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

بچے کو دودھ اگر زیادہ عرصہ تک دیا جائے تو بھی اس میں کئی قسم کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ بڑا ہو کر اعتدال سے زیادہ رجائیت پسند ہوگا۔ یہ رجائیت پسندی اُس کو سست اور کاہل بنا دے گی۔ وہ مشکلات کو خود حل کرنے کی بجائے دوسروں پر ڈالنا پسند کرے گا۔ بچپن میں اُس کی ہر خواہش ماں پورا کر دیتی تھی، اور اُس کو کسی قسم کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ اب اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے وہ کہے گا: ''کوئی بات نہیں۔ خدا سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔'' یا ''جو خدا کو منظور ہو،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہی ہوتا ہے'' وغیرہ وغیرہ اس طرح وہ خود ہمت نہ کرتے ہوئے تقدیر کا قائل ہو جاتا ہے۔ اگر مشکلات بڑھتی جائیں اور ان کو حل کرنے میں دوسرے بھی مدد نہ دیں تو وہ آہستہ آہستہ بیرونی دنیا کو چھوڑ کر خیالی دنیا میں پناہ لے گا۔ نتیجہ وہی تمام عمر کی ناکامی۔

اگر ہم بچے کی جذباتی نشوونما صحیح طور پر کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اُس کے دودھ پینے کا عرصہ نہ بہت کم ہو اور نہ بہت زیادہ، اور دودھ چھڑاتے وقت بچے کو کسی قسم کا صدمہ نہیں ہونا چاہئے۔ ماں کا بچے کو اپنی چھاتی سے دودھ پلانا اُس کی جذباتی صحت کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہ دودھ یک دم بند کر دیا جائے تو بچے کو بہت زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ماں نے اُس کو پیار کرنا بند کر دیا ہے۔ یہ احساس، اس میں خوف اور بے چینی پیدا کرے گا بالکل اُس بچے کی طرح جس کو دودھ بالکل ہی نہیں دیا گیا یا بہت کم دیا گیا۔ بچے کو اس جذباتی صدمے سے بچانے کے لئے دودھ آہستہ آہستہ چھڑانا چاہئے اور ساتھ ہی اس میں براہ راست کھانے پینے کی عادت پیدا کرنی چاہئے۔ ایسا کرتے وقت اُس کو اُسی طرح پیار کرنا چاہئے جیسا کہ پستان سے دودھ دیتے وقت تاکہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ نہ سمجھے۔ عورتیں اکثر دودھ چھڑانے کے لئے اپنے پستان پر کوئی کڑوی چیز لگا دیتی ہیں تاکہ بچہ جب بھی پستان کو منہ لگائے، منہ کڑوا ہو جائے اور وہ دودھ چھوڑ دے۔ یہ طریقہ جذباتی صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ بچے کی عزیز ترین چیز ایک تکلیف دہ چیز میں منتقل ہو جائے۔ یہ جذباتی صدمہ خوف اور عدم تحفظ کے احساس کو بڑھا دیتا ہے اور وہ ماں کو بھی بُرا سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بگڑے استاد

مس عشرت النساء

بگڑے بچے کا موضوع تو خاصا زیر بحث آ چکا ہے اور اس کی اہمیت پر کافی حد تک غور بھی ہو چکا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور کے عام بچے اور نوجوان بڑی کثرت سے غیر سماجی اور تخریبی افعال کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن شاید ''بگڑے استاد'' کا مسئلہ (اگرچہ ''بگڑے استاد'' کا لفظ کچھ انوکھا سا لگتا ہے) اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ اس پر بھی تھوڑا سا غور فرمایا جائے حالانکہ بگڑے بچے کا اصل حل بگڑے استاد کا حل ہے۔ غلط تعلیم و تربیت کے باعث کتنے ہی ایسے بچوں کی زندگیاں تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ جن میں کسی وقت نہایت اچھی صلاحیتیں تھیں اور اب بھی ہیں اور جن کے ذریعے یہ لوگ اچھے اور صحت مند شہری ___ عورت اور مرد ___ بن سکتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ جب تک دنیا میں انسان کا وجود ہے اس وقت تک اس کی یہ صلاحیتیں بھی باقی رہیں گی اور وہ لوگ اپنی اثباتی کوششوں کے ذریعہ بچوں کی ان بگڑی ہوئی شکلوں کو سنوار سکتے ہیں جو ان بچوں سے قریب رہتے ہیں یعنی والدین اور استاد۔

انسان ماحول اور وراثت سے بنتا ہے ___ وراثت والدین سے ملتی ہے اور ماحول میں سب سے پہلے والدین آتے ہیں، اس کے بعد استاد۔ اُن کے کردار بچے کی شخصیت پر لاشعوری طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ اساتذہ کا کردار اور شخصیت بچے کی ذہنی نشوونما میں، کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب بچے کو سکول میں داخل کرایا جاتا ہے تو استاد اس وقت ایک نہایت ہی مقدس ہستی کی صورت میں بچے کی زندگی سے متعارف ہوتا ہے۔

''استاد کا ادب کرو۔ ادب ایک درخت ہے تو علم اس کا پھل۔ جب درخت ہی نہ ہوگا تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھل کہاں لگے گا۔ اگر تم اس فرض سے کوتاہی کرو گے تو علم سے محروم رہو گے۔ استاد والدین اور خدا کے درمیان کڑی ہوتا ہے۔ جس نے استاد کا ادب کیا اس نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کا ادب کیا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ علم دینے والا ہے تو استاد اُسے تقسیم کرنے والا ہے۔ علیٰ حذ القیاس استاد کے حقوق کثیر التعداد ہیں جن کے تحریر کرنے کے لئے قلم کو یارا نہیں۔"

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے اگر بچہ استاد کے کردار میں توازن کی کمی یا تسلسل کا فقدان پاتا ہے تو اس کے لئے یہ تمام عقیدت مندیاں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ کسی بھی چیز کے اچھا یا بُرا ہونے کی تمیز اُس کی خوبصورتی، بدصورتی، توازن، غیر توازن، تسلسل یا غیر تسلسل کے ذریعے ہی سے ہوتی ہے۔ توازن اور تسلسل کو ہم خوبصورتی میں ہی شامل کریں گے۔ بلکہ یہ خوبصورتی کا دوسرا نام ہیں۔ انسانی کردار کے اچھے یا بُرے ہونے کی تمیز ہم اُس کے توازن ہی سے کر سکتے ہیں۔ متوازن کردار کو ہم خوبصورتی میں شامل کرتے ہیں اور غیر متوازن کو جس میں پیچیدگیاں نظر آئیں بُرے کردار کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ اگر بچے کے کردار میں ہمیں پیچیدگیاں نظر آئیں تو ہم اُسے بگڑا بچہ کہتے ہیں اور متوازن کردار والے بچے کو اچھے بچوں میں شامل کرتے ہیں۔

عام انسانی کردار کے ان دو پہلوؤں کے پیشِ نظر ہمارے استاد کا کردار بھی ان کو دو حصوں میں منقسم کر دیتا ہے: اچھے استاد اور بگڑے استاد۔

اس لفظ "بگڑے استاد" میں کچھ ایسی ناگواری سی پائی جاتی ہے کہ قلم کو بھی کچھ بارسا لگتا ہے۔ شاید ہمیں لاشعوری طور پر استاد کے حقوق یا بڑے بزرگوں کے فرمان یاد آ جاتے ہیں ممکن ہے ہم ایسے شاگردوں ہی سے متاثر ہو کر شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوا ہو:

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ اُستاد کے عوض
جی چاہتا تھا ہدیہء دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
استاد سے یہ کہتا ہے "بل پیش کیجیے"

یہ سب درست ہے اور اس کی سچائی میں رتی برابر بھی شک نہیں۔ اس لئے استاد صاحبان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ہمیں بغیر کسی جھجک کے ناخلف شاگردوں کی صف میں کھڑا کر دیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہم میں یہ ناخلفی پیدا کس طرح ہوئی؟ کیا اللہ میاں اچھی قسم کے انسان پیدا کرنا بھول

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گئے ہیں جو برخوردار اولاد اور شاگردوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے اور گستاخی کی حد یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اب شاگردوں کے قلم اُستادوں پر اٹھنے لگے ہیں۔ گستاخی معاف! یہ تو ٹھہری حق کی بات۔ ورنہ ہم شاگرد جہاں تک کہ اساتذہ کے حقوق کا تعلق ہے اب بھی ہدیہء دل پیش کرنے کو تیار ہیں بلکہ کرتے ہیں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اگر بگڑے بچوں کی یہ نشانیاں ہیں کہ بعض بہت کم کھاتے ہیں، کھانا سامنے پڑا ہے اور وہ خاموش، گُم سُم بجھے بجھے سے بیٹھے، اُسے تک رہے ہیں، گویا وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ یا کھانا سامنے آیا اور رونے کو بے اختیار جی چاہنے لگا۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ سارا دن منہ چلتا ہی رہتا ہے خواہ پیٹ کا ستیاناس ہو جائے۔ ادھر ہاتھ خالی ہوا ادھر دستِ سوال دراز۔ بعض ہیں کہ بے تحاشا روتے چلے جاتے ہیں بلکہ رونے کے لئے بہانے تراشتے ہیں۔ ایک بات پوری ہوئی تو دوسری تیار ہے حتیٰ کہ جب تک خوب پٹائی نہ ہو جائے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بعض ہیں کہ جنہیں جھوٹ سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے اور سچ بتانے سے دلی نفرت۔ ایک نمونہ ہے کہ جو کچھ ہاتھ میں آیا توڑا۔ اس درخت سے اتارا تو اس پر جا چڑھے۔ کوے کی طرح اس منڈیر پر سے شُشکارا تو دوسری پر جا بیٹھے گویا زمین پر پاؤں جمانا اُن کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس ایک قسم بڑے جھینپو، شرمیلے ڈرپوک اور دبے دبے سے بچوں کی ہے۔

بگڑے استاد بھی اسی طرز کے ہوتے ہیں۔ اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ آپ بے شک دادا جان سے بھی پوچھ لیں کہ کیا انہیں بگڑے بچے کی طرح کبھی بگڑے استاد سے بھی واسطہ پڑا کہ نہیں؟ یقیناً وہ بھی مسکراتے مسکراتے ایک آدھ مثال پیش کر ہی دیں گے اور ہاں دُور کیوں جائیں، آپ موجودہ استاد صاحبان ہی سے پوچھ کر دیکھ لیں کہ کیا انہیں اساتذہ کی کوئی ایسی قسم یاد ہے؟ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ اپنی یادداشت کو کریدیں گے تو ان کی یہ کوشش ناکام نہیں ہوگی۔

یہاں تذکیر و تانیث کی بحث نہیں۔ بس آپ اگر حساب کے استاد، جیومیٹری کے استاد، جنرل نالج کے استاد، انگریزی کے استاد، اُردو کے استاد، ڈرائنگ کے استاد اور فارسی کے استاد سے شروع ہو جائیں تو کلے میں دبائے ہوئے پان کو چباتے چباتے حساب کی رقم کو بلا مبالغہ دس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

منٹوں میں ختم کرنے والا استاد، خود بخود ذہن کی تصویروں سے باہر آ جائے گا۔ ایسے استاد کے شاگردوں کا یہ حال کہ وہ حساب کی رقم کی بجائے استاد کے کلّے، پان اور لال لال پیک پر، جو دونوں باچھوں سے بار بار باہر آنے کی کوشش میں ہوتی ہے زیادہ غور کرنے میں خواہ مخواہ مشغول ہو جاتے حتیٰ کہ وہ اپنے خواب سے اس وقت چونکتے ہیں جب استاد صاحب کھڑے کھڑے اپنا ڈنڈا دور ہی سے کسی کی بیمار پُرسی کے طور سے ہلانے لگتے ہیں۔ پھر لال لال دیدوں والے استاد کا تصور کیجئے جو ناک کے سرے پر عینک کو ٹکائے اور خود عینک کے اوپر سے دیدے نکالے، سر کو ایک خاص انداز سے جنبش دیتے ہوئے یہ دعویٰ کرتا سنائی دیتا ہے:

''بچو! میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مجھ سے کیا چھپاؤ گے میں تو تمہاری نسل نسل سے واقف ہوں۔''

معصوم دماغ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسی ہستی ہیں کہ کچھ بھی نہ ہونے پر سب کچھ جاننے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ یہ صفت تو اللہ میاں کی سنی ہے کہ وہ ہماری رگ رگ کو جانتا ہے۔ بچے کا ذہن فیصلہ کر لیتا ہے کہ جس طرح یہ حضرت خواہ مخواہ سب کچھ جاننے کا بہانہ بنا کر محض ٹھکائی کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً اللہ میاں بھی ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔

یہاں ہمیں ایک ننھے منے کی یاد آ گئی ہے۔ جس نے بڑی معصومیت سے اپنے ابا جان کے دوست کو جو گھر میں ''میاں صاحب'' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، پوچھا کہ ''کیا آپ ہی اللہ میاں ہیں؟'' خیال کیجئے بچے کا تصور ایک چھوٹی سی چیز سے کہاں سے کہاں تک پرواز کرتا ہے اور کس طرح اُس کا تجسس ہر وقت اپنے اردگرد کی دنیا کی کرید میں لگا رہتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی زندگی کے بڑے بڑے فیصلے کر رہا ہوتا ہے۔

اس کے بعد تمام رات عبادت میں گزارنے کے بعد صبح کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے والے استاد کا تصور کیجئے۔ جو ایک آدھ تگڑے سے شاگرد کو اپنے سر میں ہلکے ہلکے ٹھونکے لگوائے اور باقی کی تمام جماعت کو خاموش رکھنے کا کام دے کر خود خوابوں کی میٹھی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ شاگردِ رشید بھی استاد کے سر میں ہلکے ہلکے ٹھونکے لگانے کے بعد اپنے آپ کو اس طرح برسرِ اقتدار سمجھنا شروع کر دیتا کہ باقی کے تمام شاگردوں کے سروں میں زور زور سے ٹھونکے لگانا اُس کے فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ مجازی استاد جو ٹھہرا۔ اس لئے وہ اپنے اقتدار کا پورا پورا

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

استعمال کرتا ہے۔ استادوں میں سب سے زیادہ ڈرا دینے والی قسم ہے نکمے خاوند کے ہاتھوں جلے کٹے استاد کی۔ جس نے خاوند کے علاوہ باقی کی تمام دنیا کو چھڑی سے سدھارنا اپنا فرض سمجھا ہوا ہو۔ یقین جانئے ان صاحب کی صورت دیکھتے ہی شاگرد تھر تھر کانپنا شروع کردیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک سال کے عرصے میں تقریباً پچانوے فی صد شاگردوں کے پٹھے اور نسیں بغیر ضرورت کے پھڑکنے کی عادت میں پڑ جاتے اور یہ عادت زندگی کے آخری سانسوں تک ساتھ دینے کا عہد و پیمان لئے ہوتی ہے۔ اگر کبھی بیچارے استاد صاحب بیمار پڑ جائے تو یہ خبر بچوں کے لئے رویت ہلال کی سی خوشی لئے ہوتی ہے۔

پھر ماں باپ کو کوسنے دینے والے استاد جو بار بار احسان جتائیں کہ والدین کی مصیبت خواہ مخواہ ہمارے سر پڑی ہے۔ اب آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ ایسی حالت میں بچے کے ذہن میں اگر فیس کے پیسے آئیں تو اس میں قصور کس کا ہو سکتا ہے۔ ایک وہ استاد ہیں کہ جنہیں شاگردوں سے کھانے پینے کی چیزیں بٹورنے کی عادت ہے۔ انہیں اس چیز کی قطعاً پروا نہیں کہ یہ چیزیں اُن کے ننھے سے شاگرد کی دسترس میں کس طرح آئیں۔ اگر ایک بچہ سکول میں کھانے پینے پر کافی پیسے خرچ کرتا ہے تو وہ لاتا کہاں سے ہے۔ یا بچے کا یہ چٹورا پن بذات خود کوئی اچھی عادت نہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ چٹورے شاگرد اس قسم کے بگڑے استادوں کے مقبول شاگردوں میں سے ہوتے ہیں۔ خواہ وہ پڑھائی میں کتنے ہی نکمے کیوں نہ ہوں۔

بات کو یہاں تک ہی محدود نہ سمجھئے کہ بگڑے استادوں کا حلقہ صرف سکول تک ہی محدود ہوتا ہے اب ان سے کالج اور یونیورسٹی تک باقاعدگی سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں ذرا وہاں انداز مختلف ہوتے ہیں کیونکہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے استاد کا لفظ لیکچرار اور پروفیسر میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں تقریباً ہر لیکچرار کا ایک منظور نظر ضرور ہو گا جو باقی کے تمام شاگردوں کے لئے باعثِ رشک بنا ہوتا ہے۔ اس منظور نظر کے مختلف قسم کے فرائض ہوتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر صاحب کے تمام ذاتی کام سرانجام دینا۔ اگر مارکیٹ میں چائے اور چینی کی کمی ہو تو وہ فراہم کرے گا اور ضرور دے گا۔ اس کے علاوہ بھی استاد کے چھوٹے موٹے کاموں میں بڑی دلچسپی لے گا اور پھر تمام کالج اور یونیورسٹی کی تازہ ترین خبروں کی کاپی شام سے پہلے پہلے پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔ اس میں موٹی موٹی خبریں اکثر ہوتی ہیں کہ فلاں شاگرد کی آپ کے متعلق یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رائے ہے اور وہ یہ رائے فلاں فلاں مجلس میں بیٹھا ظاہر کر رہا تھا۔ پھر فلاں استاد آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا۔ یہ یاد رہے کہ ان تمام خدمات کا مقصد ہدیہء دل کا جذبہ نہیں لئے ہوتا بلکہ مقصد زیادہ نمبر حاصل کرنا ہوتا ہے اور پروفیسر صاحب ان تمام خبروں کو کالج کی سیاسیات میں جہاں مناسب سمجھیں استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور بھی وبا عام ہوتی ہے کہ سمارٹ پروفیسروں کے پیچھے پیچھے دل پھینک شاگرد ٹھنڈی آہیں بھرتے پھریں، یا سمارٹ شاگردوں پر نظر پڑتے ہی پروفیسر صاحب مسکرا کر کانوں تک سرخ ہو جائیں۔ اور اگر شاگرد اور استاد ہم جنس ہیں تو پھر تو اس رشتے کے استوار ہونے میں کوئی دیوار حائل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی قسم کی انگشت نمائی کے ڈر کا امکان ہوگا۔ پھر اگر استاد مارلن منرو ہے تو شاگرد برجٹ بارڈو ضرور ہوگا اور اگر استاد گریگری پیک ہے تو شاگرد راک ہڈسن ہوگا۔ بس تمام سال اس قسم کے سلسلے جاری رہتے ہیں۔

اگر یہ سب درست ہے تو ایسا کیوں ہے اور اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ اصل میں ہمارے یہاں قومی انسانی ذہن کا تصور ہی موجود نہیں۔ ہم انسان کو یا تو فقط گوشت پوست کا لوتھڑا سمجھتے ہیں یا پھر سراپا مجسمہ روحانیت۔ ذہنی تعمیر، تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ اور تعلیم محض نصاب کی کتابوں پر عبور حاصل کرنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اساتذہ کا فرض صرف کتابوں کو ختم کرانا اور طلبہ کو امتحان پاس کرانا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں شاگردوں کی ذہنی تعمیر کی قطعاً پرواہ نہیں جس کے ذریعے بچے بلند پایہ، پُراعتماد، ملنسار، سماجی شخصیتیں بن سکتے ہیں۔

مادہ اور روح دونوں تسلیم شدہ حقیقتیں ہیں۔ مادیت کے پرستار جسم کو ایک نایاب مشین سمجھتے ہوئے جس کو دوبارہ حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے، اُس کی دن رات حفاظت کرتے ہیں۔ اُسے روزانہ پونچھتے ہیں، گرد و غبار صاف کرتے ہیں، بڑھیا سے بڑھیا تیل ڈالتے ہیں تاکہ اُس کے پُرزے آپس میں رگڑ کھا کر جلد خراب نہ ہو جائیں اور ان کا چلنا کہیں وقت سے پہلے بند نہ ہو جائے۔ یعنی وہ ہر وقت اُس کے مختلف پرزوں میں اُلجھے رہتے ہیں، اُن کے ہاں روح کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اُدھر روح کی گہرائیوں میں یقین رکھنے والے، مادہ کو روح کا دشمن تصور کرتے ہیں۔ انہیں اس کا پنپنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ جسم سے نفرت کرتے ہیں، اُسے مارتے ہیں کچلتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ زہریلے ناگ سے کمتر نہیں جو روح کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی ڈس لے گا۔ یہ ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھن ہے جو اُسے اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دے گا۔ وہ جسم کو روح کے لئے قید خانہ سمجھتے ہیں جہاں وہ حُسنِ ازل سے علیحدہ ہونے کے تقاضے میں بند کر دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی اس معصوم گستاخی کی سزا پائے۔ وہ کبھی بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ جسم اور روح کے صحیح ملاپ کا نام ہی تو انسان ہے جس کا دوسرا نام ذہن ہے۔ روح اور جسم ایسے دو کنارے ہیں جن کے درمیان ذہن، اُچھلتے، مچلتے، سرکتے، چٹانوں سے ٹکراتے، گھوم گھوم کر، صاف نکل جانے والی، ایک نازک حقیقت کا نام ہے۔ اگر دو کناروں کے درمیان صرف خلا ہے اور اُن کو کوئی پل آپس میں نہیں ملاتا۔ تو ایک طرف کی مخلوق دوسری طرف جا نہیں سکتی۔ جسم ایک طرف رہ جائے گا اور روح دوسری طرف۔ یعنی ہماری زندگی میں ہمیں صرف راہب اور شیطان ہی مل سکتے ہیں۔ اگر ہم ذہن کی قدر نہیں کرتے تو ہم انسان کو ٹھکراتے ہیں اور اپنے آپ کو ٹھکرانے کے بعد ہمارے لئے مسرت اور خوش آئندگی کے کتنے امکان رہ جاتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انسان صرف ذہنی کشادگی کے ذریعے ہی مسرت حاصل کرسکتا ہے۔ اپنی سمجھ اور دوسروں کی سمجھ۔ اس پُل کو فراخ کرنے کی کوشش ہونی چاہئے تاکہ ہم بآسانی ایک دوسرے کے پاس سے گزر سکیں۔ جتنا ہم اس پُل کو تنگ کرتے جائیں گے اتنا ہی اس پر خون خرابا ہوگا۔ اتنا ہی لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنتے جائیں گے اور اتنے ہی وہ ایک دوسرے کے جسموں کے اوپر سے گزرنے پر مجبور ہوں گے۔

ذہن، جسم اور روح کے درمیان ایک حقیقتِ ازلی ہے۔ روح اور مادہ جب انسانی بچے کی شکل میں زندگی نام کی منزل پر گامزن ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ ہر طرح سادہ معصوم اور خالص ہوتے ہیں۔ یہ ماحول ہوتا ہے جو ان پر اپنی مہریں ثبت کرنی شروع کر دیتا ہے اور انسانی ذہن کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔ کس قدر مشکل اور اہم مسئلہ ہے جو کہ ہر طرح معمولی ہونے کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ لیکن بچہ تو ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ ایک کھلونا ہے۔ اس کے ہاں ہم شخصیت کو کب تسلیم کرتے ہیں۔ ہم بچوں کو مردہ کھلونے سمجھ کر ان کے ساتھ کھیلتے ہیں یا ان کو مارتے ہیں، ان کے دوست نہیں بنتے۔ ان کے ذہنوں کے اُلجھے ہوئے دھاگوں کو عقلمندی سے سُلجھانے کی بجائے ہم انہیں نوچتے کھینچتے ہیں۔ گانٹھوں کو قینچی سے کاٹ ڈالتے ہیں اور بعد میں اُن بچے کھچے دھاگوں کو بچے کے سپرد کر دیتے ہیں کہ اب وہ ان کا کچھ بنائے۔ بیچارہ بچہ! اگر ہمارے اساتذہ اور والدین جسم اور روح کے مسئلہ سے دور رہ کر یہ اُمید رکھیں کہ صحیح قسم کے انسان وجود میں لاسکتے ہیں تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ محض ان کی خام خیالی ہو گی۔ کس طرح بیمار ذہن تندرست ذہن کی پرورش کر سکتا ہے بلکہ وہ اپنے مختلف احساسات کو جن کے تلے ان کا اپنا ذہن دبا ہُوا ہو گا، بچے کے لئے اچھی خاصی (Infection) ثابت کریں گے۔

عام طور پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہمارے اساتذہ سراسر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ جس قسم کے مایوس ماحول سے آتے ہیں ان سے کس طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بچوں کی ذہنی واخلاقی تعمیر میں دلچسپی لیں۔ کسی حد تک یہ درست بھی ہے کہ ہمارے ملک میں معاش کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور عام ہے۔ اگر دوسری طرف انسانی خواہشات کی تکمیل کے متعلق سوچا جائے تو کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ اس کی کوئی انتہا ہے۔ اپنے ملک کی معاشی حالت پر غور کیا جائے تو تقریباً اسّی فی صد طبقہ ایک ہی حالت میں پایا جائے گا۔ تو پھر موجودہ خلفشار اور کش مکش کے مقابلے میں انسانی فطرت پر عقیدے کو استوار کرنے کے لئے صرف جرأت اور اعتماد کی ضرورت ہے۔ والدین اور اساتذہ جس قدر سوجھ بوجھ، محبت اور صبر واستقلال سے کام لیں گے۔ نیز اپنے بچوں پر بھروسا کریں گے اُسی قدر بچوں کے لئے بہتر ہو گا۔ اس طرح بڑے ہو کر یہی بچے بلند پایہ اور ملنسار سماجی شخصیتیں بن سکیں گے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کی علامتی اہمیت

ڈاکٹر محمد اجمل

بچے کی معصومیت دوسرے بچوں کے علاوہ ہر شخص کو متاثر کرتی ہے، ہر شخص ماں کی ممتا کی طرح بچے کی فطری شرافت کا قائل ہے، لیکن اس معصومیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ کوئی بالغ مرد یا عورت، بچوں کی صحبت میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا۔ اس صحبت میں آخر کون سی بات ہے کہ بالغ عمر کے اور بالغ نظر لوگ اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے؟ بچوں کی اہمیت پر غور و خوض کرنے والے، انہیں اپنے گھر کی رونق اور سرور تصور کرنے والے بچوں سے اتنی جلدی اُکتا کیوں جاتے ہیں؟ ہر شخص دراصل بچے کی معصومیت کا معترف ہوتے ہوئے اُس کی شرارتوں کا بھی معتقد ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی ملوکانہ صفات میں تغیر آتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ سنا ہے کہ بعض وحشی قبائل میں مرد بچوں کو منہ نہیں لگاتے۔ بچوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ مردانے میں جائیں اور کسی مرد سے بات کریں۔ جب تک وہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچتے وہ کسی مرد سے کلام نہیں کر سکتے۔

غالباً اِس جھجک اور احتراز کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بچپن کی یادوں کو شعور میں لانے سے گریز کرتا ہے کیونکہ اُن یادوں میں شامل جنسی احساسات، تخریبی محرکات اور اعمال کی یادیں بھی ہوتی ہیں۔ لاشعوری طور پر ہم بالغ افراد بچے کی معصومیت سے متاثر ہوتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ابھی اسی معصومیت کی فضا میں کوئی فتنہ اور غبار اُٹھے گا۔ ابھی اس پاک دامنی سے وہ جنسی کج روی عیاں ہوگی کہ ہمارا ضمیر اور ہماری نیک تربیت بے چادری کا شکوہ کرنے لگے گی۔

بچے کی معصومیت کا افسانہ بالغوں کے لئے اپنے باطن کے شر اور فساد کو ضبط میں لانے اور رکھنے کا ذریعہ ہے۔ بچے کا وجود بار بار ہمارے ذہن میں ایسی لرزشیں پیدا کرتا ہے جو فوراً لاشعور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں جذب ہو جاتی ہیں اور وہاں دبی ہوئی محرکات کو اس طرح اُکساتی ہیں کہ انہیں کوئی نہ کوئی ذریعہء اظہار ڈھونڈے ہی بنتی ہے لیکن بسا اوقات اس سے پیشتر کہ وہ کسی اظہار کے ذریعہ کھل کھیلیں، ہم بلوغت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن پر چند اور پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ اِس طرح شعور اور لاشعور میں یہ چشمک اور یہ تصادم جاری رہتا ہے جس کی وجہ سے ہم بچے کے صحیح خیالات اور صحیح احساسات کو جاننے اور سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

بچہ خواب سناتا ہے، آپ بے اعتنائی سے اُس کے خواب کو ٹال دیتے ہیں۔ بچہ خدا اور قیامت کے متعلق آپ سے تکلیف دہ سوال کرتا ہے، آپ اُس کے سوالوں کو بیہودہ اور لایعنی سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اگر آپ کے ایمان میں منطق کو سمانے کی گنجائش نہیں تو آپ ان سوالوں سے نہ صرف یہ کہ برانگیختہ ہوتے ہیں، بلکہ اُسے ڈانٹتے اور پیٹتے ہیں۔ بچہ رات کے اندھیرے سے ڈرتا ہے، آپ منطق کے ذریعہ اُس کا ڈر دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچہ اپنے حریف یعنی دوسرے بچہ کے وجود سے جلتا ہے، آپ اِس فطری حسد کو سمجھنے کی بجائے اس کی فطری خباثت پر محمول کرتے ہیں۔ بچہ جھوٹ بولتا ہے، آپ اُس کے واہمہ کی پرواز کی نوعیت کو نہیں سمجھتے۔ آپ اُسے ''بُرا'' کہہ کر زدوکوب کرتے ہیں۔ بچہ چوری کرتا ہے آپ اُس کی چوری کو محبت کی ہوس نہیں سمجھتے بلکہ اُسے چور کہہ کر اُس کے ضمیر کو غیر معقول پابندیوں میں اُلجھا دیتے ہیں۔ بچہ جنس میں صحت مند شغف کا اظہار کرتا ہے، آپ اِسے قبل از وقت خللِ دماغ اور بداخلاقی تصور کرتے ہیں۔ آپ اس طرح کم آگہی کا ثبوت دیتے ہیں اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ آپ بچے کو ''معصوم'' سمجھتے ہیں۔ بچے کے تصور کو معصومیت کے خاصے کے ساتھ وابستہ کر کے آپ اپنے ماضی کو ''معصوم'' بنانا چاہتے ہیں لیکن اگر اس دنیا کی گہما گہمی میں آپ کو کبھی گوشہء خلوت میسر ہو تو اپنے ماضی کے حسین اور قبیح دونوں پہلوؤں کو یاد کرنے کی کوشش کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ حسین اور نیک پہلو تو فوراً حافظے میں روشن ہو جاتے ہیں، لیکن قبیح پہلو جونہی حافظے میں آنے کی کوشش کرتے ہیں، کوئی نہ کوئی جھجک، کوئی نہ کوئی حجاب انہیں پوری طرح یاد آنے سے روکتا ہے، لیکن اگر اُن کی یاد، چاہے وہ ادھوری ہو یا پوری ذہن میں آجائے تو ذہن پر تیرگی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ گویا وہ یادیں نہیں تاریکی کی لہریں ہیں۔ ہم تاریکی کی ان لہروں سے ڈرتے ہیں اور پھر حیران ہوتے ہیں کہ بچہ رات کے اندھیرے سے کیوں خائف ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کی شخصیت کے غیر معقول پہلوؤں کی نوعیت اور اسباب پر غور کرنے کے لئے ہمیں، جن پر بچے کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت اور نشوونما کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اپنے ماضی اور اپنے بچپن کو متصل اپنے شعور میں منسلک کرنے کی کوشش کرنا ہوگی، اس ضمن میں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔

لندن کے ایک کلینک (Clinic) میں ایک ماں اپنے دس سال کے ایک بیٹے کو لائی اور ذہنی معالج سے کہنے لگی کہ

> ''میرے بیٹے کو بند جگہوں سے بہت خوف آتا ہے۔ کمرے کے کواڑ بند کردو تو وہ چیخنے لگتا ہے۔ سیڑھیاں بند ہوں تو یہ ڈرتا ہے، زمین دوز ریل گاڑیوں میں یہ سفر نہیں کرسکتا۔''

معالج نے ماں سے چند ضروری سوالات پوچھے اور ضروری معلومات حاصل کیں۔ پھر اُس نے پوچھا۔ ''آپ کو بھی بچپن میں کبھی بند جگہوں سے خوف تو نہیں آتا تھا؟'' ماں نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر معالج کے اصرار پر اُس نے اپنے حافظے پر زور دیا۔ اُسے یکا یک یاد آیا کہ وہ جب دس سال کی تھی تو اُسے بھی بند جگہوں سے ڈر آتا تھا۔ ماں جب اس تاریک یاد کو اپنے شعور میں لائی تو بچے کا ڈر بھی دور ہوگیا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے مقصد صرف یہ تھا کہ بچے کی ذہنی صحت کا بہت حد تک انحصار صرف اس بات پر ہے کہ آپ اپنی مرضی کی تاریک یادوں کو کس حد تک شعور میں جگہ دیتے ہیں۔

بچے کے احساسات، توہمات اور خیالات کو سمجھنے کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ سمجھنے والا اپنے ماضی کے تاریک اور تیرہ پہلوؤں کو فراموش نہ کرچکا ہو، وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ سمجھنے والے میں خود بہت حد تک بچہ بننے کی بھی صلاحیت ہو، اس سے یہ مراد نہیں کہ جس شخص میں غیر ارادی طور پر طفلانہ عادات اور خصائل ہوں، وہی بچوں کو خوب سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بالغ جس کی حرکات اور جس کا کردار طفلانہ ہو، اپنے آپ میں اس قدر اُلجھا ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے احساسات پر ہمدردی سے نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باشعور انسان، جس کی قوت ارادی اپنے ماضی کی تیرگی کو چھپانے کے عمل پر استوار نہیں ہوئی اور جس کی شخصیت کے مختلف عناصر، اُس کے شعور میں رچ بس چکے ہیں، وہی انسان ارادتاً وطوعاً بچہ بن سکتا ہے، وہی انسان بچے کے تصور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی علامتی اہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔

شعور کو بچے کے تصور سے آشنا کرنے اور اس تصور کو آ گہی کی رگ رگ میں بسانے سے، نشوونما اور تغیر کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں، چنانچہ جن تہذیبوں کے قوانین، فنونِ لطیفہ اور علوم میں بچے کا تصور بدرجہ، اتم اہم ہے، اُن میں پھلنے پھولنے، بڑھنے اور ترقی کرنے کے اَن گنت امکانات ہیں، اور اِن امکانات کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، بچہ ایک نئی زندگی کی علامت ہے نت نئی حرکات، یعنی تخلیقی اعمال کی علامت ہے، بے پناہ اور اَن تھک تجسس کی علامت ہے۔ جن تہذیبوں نے بچے کی اہمیت (اپنی رُوحانی زندگی کی اہمیت) سے انکار کیا ہے۔ اُن میں نہ تو نشوونما کے امکانات رہتے ہیں اور نہ اُن کی نظر انسانی فطرت کے گونا گوں امکانات کا جائزہ لیتی ہے، وہ مستقبل کو ماضی اور حال سے مختلف سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، مستقبل اُن کے لئے محض حال کا تواردا ور ماضی کا سرقہ ہے۔

پاکستان میں بھی ابھی بچے کی علامتی حیثیت کا پورا احساس پیدا نہیں ہوا، چنانچہ ہمارے ہاں بچوں کا ادب بھی بالغ حیثیت میں موجود نہیں ہے، ہمیں اپنے پیغمبر آخرِ زمان صلی اللہ علیہ واسلم کی بلوغت کے بعد کے واقعات تو بہت معلوم ہیں لیکن اُن کے بچپن کی زندگی کے بارے میں ہمارا علم خاصا ناقص ہے۔ بچوں کی تعلیم اور تربیت کے متعلق ہمارا فکر خام اور تشنہ ہے۔ بچے کی حفاظت اور اُس کے ماحول کو صحت مند بنانے کی کوشش اور کاوش ابھی ہمارے ہاں محض ابتدائی حیثیت رکھتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ احساس اب پیدا ہو رہا ہے اور جابجا لوگ پاکستانی بچوں کی فلاح و بہبود کے متعلق غور کر رہے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کی رہنمائی کا کلینک

ڈاکٹر مس اقبال ڈار

سبھی بچوں کو گھر اور مدرسے میں کبھی کبھی مشکلات درپیش ہوتی ہیں__ ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب طبیعت پر تفکرات کا بوجھ، مزاج میں اشتعال اور مسلسل خوف اور مشکلات کا احساس اُن پر حاوی ہوتا ہے۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے بچوں کی رہنمائی، والدین اور اساتذہ کی ایک مستقل ذمہ داری ہے۔ رہنمائی کا یہ فریضہ وہ کبھی کبھار شعوری طور پر انجام دیتے ہیں، لیکن انہیں اکثر و بیشتر اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ رفعِ مشکلات میں ان کی مدد بچوں کے شاملِ حال رہی ہے۔ بہرحال، بعض ایسے بچے بھی ملتے ہیں، جن کی جذباتی مشکلات بدستور رہتی ہیں، باوجودیکہ والدین اور اساتذہ تمام دانش مندانہ صورتیں اختیار کرتے ہیں، ایسے بچے افسردہ اور جذباتی طور پر بے چین رہتے ہیں۔ یہ وہی بچے ہیں، جن کے بارے میں احساس ہوتا ہے کہ گھر میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ مانگتے رہتے ہیں، جو مدرسے کے ماحول سے مفاہمت نہیں کر سکتے، جو اپنے ہمجولیوں میں دوست نہیں بنا سکتے، اور جنہیں کھیل کود سے دلچسپی نہیں ہوتی، وہ بچے جو اس قدر اہم جذباتی مسائل سے دوچار ہوں، خاص توجہ اور امداد کے مستحق ہیں۔

ہمارے ملک میں والدین اور اساتذہ ایسے بچوں کے بارے میں اکثر فکرمند رہتے ہیں اور صورتِ حالات سے مایوس ہو جاتے ہیں کیونکہ ان بچوں کے لئے کسی طرح کی مدد حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مدد کہاں سے لی جائے؟ یہ بات بجائے خود ایک مسئلہ ہوتی ہے، اس لئے کہ صرف تربیت یافتہ اور مستند افراد ہی بچوں کے مسائل کو کامیابی سے حل کر سکتے ہیں۔ ایسے تربیت یافتہ اور مستند افراد سے ملاقات رہنمائی اطفال کے کلینک میں کی جا سکتی ہے۔ یہ کلینک بچوں،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کے والدین اور اساتذہ کی اعانت کا وسیلہ ہوتا ہے۔ کلینک میں تربیت یافتہ افراد موجود ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کی مشکلات کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر ہر بچے کو صحیح راہ پر لانے کے لئے مؤثر تدبیریں اختیار کرتے ہیں۔

جب کسی خاص مسئلے کی بنا پر کسی بچے کا معاملہ کلینک کے سپرد کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے والدین کو اطلاع دی جاتی ہے کہ بچے کو کلینک میں لائیں۔ والدین سے گزارش کی جاتی ہے کہ بچے کو اس بارے میں پہلے سے تیار کریں۔ والدین کے لئے عام طور پر اپنے بچے کو اس طرح سمجھانا مناسب ہوگا کہ تم اتنے خوش نہیں رہتے، جتنا خوش تمہیں رہنا چاہئے اور کوئی ایسی ہی بات ہے جو تمہاری خوش دلی میں آڑے آتی ہے اور اب ہم تمہیں ایک خاص طرح کے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں جو تمہاری اس طرح مدد کرے گا کہ تم گھر میں اور مدرسے میں، ہر جگہ خوب خوش رہو گے۔ بچے کو اچھی طرح اطمینان دلا دینا چاہئے کہ وہ خاص ڈاکٹر تمہارا معائنہ نہیں کرے گا اور کوئی دوا یا ٹیکا نہیں دے گا، بچے کو بتا دینا چاہئے کہ تم وہاں جا کر بہت خوش ہو گے، کیونکہ وہاں کھیلنے کے لئے اچھے اچھے کھلونے ملیں گے اور پڑھنے کے لئے کہانیوں کی کتابیں۔

بچہ، جب کلینک میں لایا جاتا ہے تو نفسیات داں (Psychologist) اس کے ساتھ دوستی پیدا کر لیتا ہے۔ اب بچہ اس ماحول میں پوری آسائش محسوس کرتا ہے۔ اس دوران میں سوشل ورکر، بچے کے والدین سے اصل مسئلے پر تبادلہ خیالات کرتا ہے اور اس مدرسے کے بارے میں، جہاں بچہ پڑھتا ہے۔ نیز مدرسے میں اس کے طرز عمل کی بابت اطلاعات حاصل کرتا ہے۔ مسئلے کی تشخیص اور علاج کی جانب پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ والدین سے بچے کا طبی معائنہ کرانے کے لئے کہا جائے۔ طبی رپورٹ حاصل ہونے کے بعد، سوشل ورکر بچے کے گھر جاتا ہے تاکہ مسئلے کی نوعیت پر زیادہ تفصیل سے بات چیت کر سکے اور معلوم کرے کہ وہ مسئلہ پیدا کیوں کر ہوا اور کس طرح کی مدد درکار ہے۔ سوشل ورکر بچے کے استاد سے بھی رابطہ پیدا کرتا ہے اور مدرسے میں بچے کے رویے کی بابت مزید اطلاعات حاصل کرتا ہے۔

ماہرِ نفسیات، جسے ذہانت اور شخصیت کے امتحان لینے اور نتائج مرتب کرنے کی مہارت حاصل ہوتی ہے، دونوں طرح سے بچے کا امتحان لیتا ہے۔ ان امتحانات کے نتائج سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک بچہ دوسرے سے مختلف کیوں ہے؟ مختلف حالات سے دوچار ہونے پر اس کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ردِ عمل کیا ہوتا ہے اور اسے اگر مدد دی جائے تو کہاں تک سود مند ہوگی؟ بچے کے جذباتی مسئلے کی صحیح تشخیص کی خاطر سائنٹیفک اطلاع حاصل ہونی ضروری ہے۔

جب سماجی کارکن بچے کی (1) صحت جسمانی اور ماحول (2) گھریلو کوائف کا پس منظر اور (3) مدرسے میں اس کے رویے کی بابت اطلاعات حاصل کر چکتا ہے اور نفسیات داں اس کی ذہانت اور شخصیت کے بارے میں سائنٹیفک معلومات بہم پہنچاتا ہے، کلینک کا عملہ باہم سر جوڑ کر مسئلے پر غور کرتا ہے۔ اگر یہ مسئلہ معمولی نوعیت کا ہے اور بچے کی شخصیت میں اس کی جڑیں گہری نہیں، تو عملے کے لوگ بچے کی امداد کے پیشِ نظر والدین اور اساتذہ کو سادہ سے مشورے دے دیتے ہیں۔

جمیلہ کی امی اسے لے کر کلینک میں آئیں۔ بچی کی ماں اور اس کے دادا میاں اور دادی اماں کو یہ یقین تھا کہ جمیلہ کند ذہن ہے۔ ماں نے بات شروع کی:

''جمیلہ، میرے دوسرے بچوں کی طرح بالکل نہیں، دوسرے بچے خاصے ذہین ہیں اور یہ ابھی پانچویں میں پڑھتی ہے، حالانکہ اس کی عمر کی بچیاں اس سے بہت آگے ہیں۔ اس کے ابو، اسے ڈاکٹری پڑھانا چاہتے ہیں لیکن یہ تو سکول کے کاموں میں بالکل ہی پھسڈی ہے۔''

جمیلہ کی ذہانت کا امتحان لیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ ذہانت کی اوسط سطح سے بلند ہے بلکہ غیر معمولی ذہانت کی علامتیں اس میں موجود ہیں۔ اب چونکہ والدین کا یہ خیال ہے کہ جمیلہ کند ذہن ہے، غلط ثابت ہو چکا تھا۔ لہٰذا نفسیات داں نے اس کی کمزوری کے اسباب کی تلاش میں دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا۔ کھیلتے وقت اس کو بہ غور دیکھنے اور بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ جمیلہ کو اپنی کتابوں کے مطالعے میں دشواری ہوتی ہے، حتیٰ کہ جماعت میں تختہ سیاہ پر لکھی ہوئی عبارت بھی اسے نظر نہیں آتی۔ نفسیات داں نے اس سے پوچھا ''کیا تم نے اس بارے میں اپنے ماں باپ سے بات کی تھی؟'' بیچاری بچی زار و قطار رونے لگی، بولی:

''میں نے امی اور ابو سے اکثر کہا کہ مجھے سر میں شدید درد رہتا ہے اور مشکل سے ہی کچھ نظر آتا ہے، لیکن دادی اماں مجھے یہ کہہ کر جھڑک دیتی ہے کہ تو تو کام سے بچنے کے لئے بیمار بنتی ہے۔ اس لئے میں چپ چاپ سکول چلی جاتی ہوں کتابوں میں اپنا سر کھپاتی ہوں، حالانکہ وہ مجھ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑھی بھی نہیں جاتیں اور اسی لئے سمجھ میں بھی نہیں آتیں تب ہی تو، میں پریشان اور افسردہ رہتی ہوں''۔

والدہ سے کہا گیا کہ جمیلہ کو امراضِ چشم کے کسی ماہر کے ہاں لے جائیں اور اس کی آنکھوں کا معائنہ کرائیں۔ اب جمیلہ عینک لگاتی ہے۔ وہ ایک ہنس مکھ بچی ہے اور والدین، اب اسے کُند ذہن نہیں سمجھتے۔

مسئلہ اگر سنگین اور پیچیدہ ہو تو کلینک کا عملہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ بچے کو ہفتے میں ایک بار، لگاتار ایک مہینے تک کلینک میں ساتھ لانا چاہئے۔ جذباتی مشکلات میں مبتلا بچوں کے لئے ''کھیل کے ذریعے علاج'' (Play Therapy) کا خاص طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ بہرحال، اس سے قطع نظر، بچوں کو ذہنی آسودگی فراہم کرنے میں جن ذرائع سے مدد ملتی ہے، ان میں نفسیاتی علاج اور 'علاج بذریعہ اجتماع' (Group Therapy) کے علاوہ ماحول کی تبدیلی اور والدین کے رویئے میں ترمیم کی صورتیں بھی شامل ہیں۔ کھیل کود کے ذریعے علاج (Play Therapy) کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح بچوں کو اپنی مشکلات پر خود قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ طریق علاج، اس حقیقت پر مبنی ہے کہ کھیل، بچے کے لئے اپنی شخصیت کے اظہار کا فطری ذریعہ ہے۔ بچہ اپنے محسوسات کو کھیل ہی کھیل میں ٹھیک اسی طرح ظاہر کرتا ہے، جیسے بالغ افراد اپنے محسوسات کو لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ بچہ اپنے احساسات کو کھیل کے پیرایے میں ظاہر کرتے وقت دراصل ان احساسات کا مقابلہ کرتا ہے اور ان پر قابو پانے کے طریقے سیکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کسی طرح کا جذباتی تناؤ محسوس نہیں کرتا بلکہ یک گونہ جذباتی طمانیت حاصل کرتا ہے۔

بچہ جوں ہی کلینک میں علاج کی خاطر داخل ہوتا ہے، اسے کھیل کے کمرے میں لے جاتے ہیں وہاں پہنچ کر بچہ جو کچھ کرنا چاہے اُسے کرنے دیا جاتا ہے، اور جیسے چاہے، اُسے کھیلنے کی اجازت ہوتی ہے۔ پہلے دن بچہ پس وپیش ظاہر کرتا ہے اور ہر طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے لیکن رفتہ رفتہ کھیل کے کمرے میں صورتِ حالات سے مانوس ہو جاتا ہے اور وہ آزادی جو میسر آئی ہے، اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا شروع کرتا ہے۔ اچانک اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی یہ احساس کہ وہ جو کچھ کہنا چاہے، کہہ سکتا ہے۔ وہ کھلونوں سے آزادانہ طور پر کھیل سکتا ہے اور وہ ہر شخص سے اپنی مرضی کے مطابق نفرت اور محبت کر سکتا ہے۔ اسے پوری آزادی حاصل ہے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیزی دکھائے یا سستی، غرضکہ وہ جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی، اسی طرح اسے قبول کیا جاتا ہے۔ ماہر معالج کی پسندیدگی اور اس کے ساتھ مفاہمت کی بنا پر، بچہ کلینک میں وہاں کی بعض کوتاہیوں کے باوجود آہستہ آہستہ تحفظ کا احساس پالیتا ہے۔

رضیہ نے جب یہ دیکھا کہ اس کے ساتھ سلوک میں وقار اور احترام شامل ہے اور کوئی شخص اس پر حرف گیری اور ملامت نہیں کرتا تو اس نے اپنے بھائی کو کلینک میں ساتھ لانے کی خواہش ظاہر کی۔ جب رضیہ سے اس خواہش کا سبب پوچھا گیا تو وہ برجستہ بول اُٹھی:

''میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی یہاں کی آزادی کا لطف اُٹھائے، گھر میں، اسے اپنی مرضی کے مطابق کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی، مجھے پتہ ہے کہ یہ جگہ اسے بہت پسند آئے گی۔''

دوسری بار وہ اپنے ننھے بھائی کو ساتھ لائی اور بڑے ٹھاٹ سے کلینک کی ہر چیز اُسے دکھاتی پھری، ساتھ ساتھ کہتی جاتی تھی ''فرید! یہاں کوئی روک ٹوک نہیں کرے گا جو چیز پسند آئے۔ اٹھا لو۔ جی چاہے تو گڑیوں سے کھیلو۔'':

وہ تمام گڑیاں اور گڑیوں کا گھروندہ، گھروندے کی کرسیاں، میزیں اور پلنگ اور کھانے پکانے کے برتن، پیالیاں اور پلیٹیں، دونوں بچوں نے اُٹھالیں۔ انہوں نے گھر کا کھیل کھیلنا شروع کردیا، سارے کھلونے یعنی گڑیا اور گڈا اور گڑیا گڈے کے بچے، رہائش کے کمرے میں صوفوں پر بٹھا دیئے گئے۔ وہ ایک شادی کی تقریب منا رہے تھے۔ ایک گڑیا سونے کے کمرے میں پلنگ پر پاؤں پسارے پڑی تھی۔ جب بچوں سے پوچھا گیا کہ ''یہ کون ہے اور آخر بستر میں کیوں لیٹی ہے'' تو انہوں نے جواب دیا۔ ''یہ میزبان ہے ___ گھر کی مالکن ہے۔ بے چاری کی طبیعت ٹھیک نہیں، بہت تھک گئی ہے۔'' رضیہ نے کہا، ''جب اُسے کوئی کام کرنا پڑے تو ہمیشہ یونہی تھک جاتی ہے اور اس کا جی الٹنے لگتا ہے۔'' دراصل یہ بچے کھیل ہی کھیل میں نفسیات دان کو یہ بتا رہے تھے کہ ان کی ماں مستقل بیمار ہے اور زیادہ تر بستر میں پڑی رہتی ہے۔

بچوں کو گڑیوں کے علاوہ رنگین چاک، رنگ، گندھی ہوئی مٹی، صورت گری کے سامان اور معمے والے کھلونے کھیلنے کو ملتے ہیں۔ ان کے لئے چابی کے کھلونے موجود ہوتے ہیں۔ ان کے پاس تصویریں تراشنے اور جوڑنے کے لئے حاضر ہوتی ہیں۔ وہ چاہیں تو انگلیاں رنگ میں ڈبو کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رنگین تصویریں بنائیں اور اُن کا جی چاہے تو لکڑی کے چوکور ٹکڑوں کو جوڑ کر عمارت کھڑی کریں۔ کھیل کے یہ سارے سامان، بچوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع مہیا کرتے ہیں۔ اس آزادانہ اظہار کی بنا پر اُن کا عصبی تناؤ دور ہو جاتا ہے اور جذبات کو قرار مل جاتا ہے۔

کلینک میں بچے کے علاج کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ اس کے والدین کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ والدین اکثر بیشتر اپنے غلط رویے سے بچے کے مسئلہ کو کچھ اور زیادہ الجھا دیتے ہیں۔ سوشل ورکر کا یہ فرض ہے کہ والدین کا اعتماد حاصل کرے اور انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنے میں مدد دے، اس طرح کے والدین یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ غیر معمولی حفاظت، لعنت وملامت، موقع بے موقع بچوں کا آپس میں تقابل اور ان کی ذات سے بیجا مطالبے، بچوں کے مزاج میں پیچیدگی پیدا کر دیتے ہیں۔ سوشل ورکر اور نفسیات داں کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ طور پر اور دانشمندی کے ساتھ کام کریں۔ انہیں والدین کو یہ محسوس کرا دینا چاہئے کہ جذباتی عوارض میں مبتلا بچوں کی جذباتی آسودگی کے لئے بچے اور والدین کے مابین صحت مند تعلقات ناگزیر ہیں۔

کبھی کبھی بچے کے مسئلے کا آسان حل یہ نظر آتا ہے کہ اس کے ماحول میں تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ تاہم اس طریقے کو کم کم اور بڑی احتیاط سے استعمال کرنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ بچے کو اس کے ماحول سے علیحدہ کرنے کے بعد عارضی طور پر افاقہ ہو جائے لیکن مرض کے اسباب، جن کی جڑیں دور تک پیوست ہوتی ہیں، اس طرح رفع نہیں کئے جا سکتے۔ بچے کے ماحول کو تبدیل کرنے سے کہیں زیادہ بہتر بات یہ ہوگی کہ والدین اور اساتذہ کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔

ماہرین، اس بچے کا علاج، جو خاص توجہ کا مستحق ہے، کس طرح کرتے ہیں، اسے یوں سمجھنا چاہئے یہاں دو سیدھے سادے سوال پوچھے جائیں گے۔

اوّل ''کیا والدین اور اساتذہ کو یہ علم ہے کہ انہیں بچے کے سلسلے میں مطلوبہ امداد حاصل ہو سکتی ہے؟'' دوم ''کیا وہ اپنے بچوں کے لئے امداد حاصل کرنے کی غرض سے ماہرین کی جانب رجوع ہوتے ہیں؟''

والدین اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کو یہ علم ہے کہ مدد کہاں سے حاصل کی جا سکتی ہے لیکن بہت کم ہی لوگ اس سے افادہ کرتے ہیں۔ بچوں کی رہنمائی اور علاج کے بارے میں بیشتر والدین

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعض تعصبات میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک غلط طرح کے وقار اور خاندانی غرور کے جذبے میں بھی مبتلا رہتے ہیں۔ بعض والدین کا گمان ہے کہ کلینک میں محض 'سڑی' بچے بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو اگر کلینک میں لے گئے تو لوگوں کو پتا چل جائے گا۔ انہیں اس تصور سے ہی شرم آتی ہے کہ اپنے بچے کے لئے خاص طرح کی امداد حاصل کریں۔ ان والدین کو معلوم ہونا چاہئے کہ رہنمائی کے کلینک ایسے بچوں کے لئے بنائے گئے ہیں جو بعض جذباتی الجھنوں میں مبتلا ہیں نہ کہ بقول ان کے ''سڑی'' بچوں کے لئے۔ کسی بچے کو کلینک میں لانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے بخار آنے پر اسے ڈاکٹر کے پاس پہنچایا جائے۔ اگر طبی علاج میں کوئی شرم نہیں اور کوئی احساسِ جرم اس کے ساتھ وابستہ نہیں تو نفسیاتی علاج میں کیا شرم۔

رہنمائی کے کلینک یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان میں تمام مشکلات کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ بعض مشکلات ایسی ہیں جن کا علاج ممکن نہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ڈاکٹر بعض جسمانی بیماریوں کے علاج میں معذور ہوتا ہے۔ تاہم بچوں کی بیشتر مشکلات میں بڑی حد تک ان کی اصلاح کی جا سکتی ہے اور مناسب علاج سے بعض مشکلات کلیتاً رفع کی جا سکتی ہے۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میری امی

مسز ستنام محمود

میری اچھی امی! آج آپ سے دو باتیں کرلوں؟ وہ بچی باتیں جو مجھے اکثر یاد آتی ہیں اور جن کی یاد سے بچپن کی خوشیاں اور گلے پھر تازہ ہو جاتے ہیں۔ ویسے تو آپ خود ہی کہا کرتی ہیں کہ ہمیشہ سچ بولا کرو، مگر سچ پوچھئے تو بڑوں کے سامنے سچ کہنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی۔ ہوتی بھی کیسے امی، بڑے جب کوئی بات کہیں تو سچ کہلاتا ہے مگر جب میں وہی بات کہوں تو آپ بھی اُسے گستاخی کہتی ہیں۔ میں گلہ نہیں کرتی بلکہ آج تو مجھے اُن باتوں پر اور خاص طور پر آپ کی معصومیت پر بے اختیار ہنسی آ رہی ہے۔ بچپن کی یاد دھیمی سی باقی رہ گئی ہے مگر آپ کی باتیں تو مجھے یوں یاد ہیں جیسے کل کی ہوں۔

مجھے گود میں لے کر تھپک تھپک کر سلانا اب تک یاد ہے۔ جوں جوں رات گزرتی آپ کی تھپکی زیادہ سخت ہو جاتی۔ آپ کی میٹھی اور ہلکی لوریاں تھکے تھکے بوجھل گیت بن جاتیں۔ مگر میں اُس دھک کی عادی ہوگئی تھی جو میری پیٹھ پر آپ کا ہاتھ لگنے سے پیدا ہوتی اور جب اس کے بغیر سو نہ سکتی تھی۔ آپ تھک جاتیں تو تھپکی تھپڑ میں تبدیل ہو جاتی اور لوریاں گالی بن جاتیں۔

''سوتی مرتی بھی نہیں۔ میرا خون پی لیا ہے۔''

میں رو پڑتی۔ رونا سن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی آ جاتے تو آپ بھی رونا شروع کرتیں۔ سب کو کوستیں، اپنی بے چینی اور تکلیف کے اور دوسروں کی لاپرواہی کے قصے سناتیں۔ میں بھی رو رو کر اپنا حال اور ہم دونوں پچھلی باتیں بھول جاتے۔

امی! جب سے میں نے آس پاس کے لوگوں اور رشتہ داروں کو پہچاننا شروع کیا اور اُن کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الفاظ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگے۔ یہی یاد ہے کہ ہر ایک مجھے دیکھ کر کہتا "اس تیسری لڑکی کی کیا ضرورت تھی، خدا بیٹا دے دیتا تو کیا تھا۔" میں سب کی طرف سہم کر دیکھتی اور اپنا قصور نہ سمجھتے ہوئے بھی خود کو قصور وار سمجھتی۔ آپ کی نگاہوں میں شکوے کے باوجود مامتا دکھائی دیتی اور میں سمجھتی کہ آپ نے میرا لڑکی ہونا معاف کر دیا ہے۔

مگر سب سے زیادہ کوفت مجھے اس وقت ہوئی جب ابّا گھر آئے۔ آپ انہیں حساب کتاب اور گھر کے حالات سناتے وقت زور زور سے بولتیں۔ پیسے کی کمی کی شکایت کرتیں۔ اُن کی غفلت کا شکوہ ہوتا۔ میں پاس بیٹھی کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی طرف دیکھتی۔ دونوں زور سے بولتے اور میں کانپ جاتی۔ آخر ابّا اُٹھ کر باہر چلے جاتے اور آپ رو رو کر کہتیں۔ "آج میرا کوئی بیٹا ہوتا تو مجھے کسی کی پرواہ نہ ہوتی۔" مجھے اپنی بے بسی اور قصور کا احساس کئی گنا زیادہ ہو جاتا۔

آپ گھر کے کام کاج میں بہت مصروف رہتیں۔ ابّا کام پر باہر چلے جاتے۔ بہنیں سکول جاتیں۔ میرے لئے کسی کے پاس کہاں وقت تھا۔ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے میں اکثر روتی۔ دادی خالہ اور سب گھر والے مجھے "روندو" کے نام سے پکارتے اور میرا منہ بند کرنے کے لئے اکثر مجھے وقت بے وقت روٹی کا ٹکڑا تھما دیا جاتا۔ میں کچھ دیر کو خاموش ہو جاتی اور اکثر ایک کونے میں چند ٹوٹے پھوٹے کھلونوں سے کھیلتی رہتی اور جب اُکتا جاتی تو کئی بار وہیں سو جاتی۔

کچھ غفلت اور کچھ بے اعتدالی کی وجہ سے میری شکل و صورت میں بھی دلکشی نہیں تھی۔ پتلی پتلی ٹیڑھی ٹانگیں، بڑھا ہوا پیٹ، اُلجھے ہوئے بال اور اُداس آنکھیں۔ مگر اِس بھدّی صورت کا الزام بھی مجھ پر ہی عائد ہوتا تھا۔ "نہ جانے اس کی صورت کس پر ہے۔" یہ جملہ میں اکثر سنتی اور سب کی طرف شکوہ آمیز مگر بے اثر نظروں سے دیکھتی۔

چلنا پھرنا شروع کیا تو میں ہر چیز کو دیکھتی اور پرکھتی۔ تمام دن مجھے آپ کے یہ الفاظ سنائی دیتے۔ "مت چھیڑو"۔ "میز کو ہاتھ نہ لگا"۔ "الماری مت کھولو"۔ "ڈبے کا ڈھکنا نہ اُٹھاؤ اس میں کاٹنے والی چیز ہے"۔ مگر کبھی کسی نے یہ نہ کہا۔ "آؤ میں تمہیں سب چیزیں دکھاؤں۔ میں سمجھاؤں کہ یہ کیا ہیں۔" مہمان آتے تو آپ کہتیں۔ "جب سے اِسے ٹانگیں لگ گئی ہیں یہ تو مصیبت بن گئی ہے۔" میں کبھی اپنی ٹانگوں کو دیکھتی اور کبھی سوچتی کہ "مصیبت" کیا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز آپ کی کسی سہیلی نے مجھ سے نام پوچھا تو میں نے جواب دیا "مصیبت"۔ آپ دونوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتنے زور سے ہنسیں کہ میں کانپ گئی۔

میری سگھڑ امی! آپ کو گھر صاف ستھرا رکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں ابھی چار ہی سال کی تھی کہ یہ شوق مجھ میں بھی آپ ہی کی طرح پیدا ہوا۔ جھاڑن پکڑ کر میں بھی میز صاف کرتی، جوتیاں پونچھتی، کنگھی دھوتی، تولیہ دھوپ میں ڈالتی۔ ایک روز آپ کا سنگھار میز صاف کر رہی تھی نہ جانے کیسے میرے ہاتھ کا جھٹکا لگنے سے عطر کی ایک شیشی گر کر ٹوٹ گئی۔ آپ نے گھوم کر دیکھا، ایک تھپڑ میرے منہ پر مارا اور کہا۔ ''کتنی بات تمہیں منع کیا ہے کہ میرے میز کو ہاتھ نہ لگایا کرو۔'' میں باہر نکل گئی۔ گھنٹوں اپنی گڑیا سے باتیں کرتی رہی۔ اُسے مجھ سے ہمدردی تھی۔ وہ میری باتیں صبر سے سنتی تھی۔

میرا شیشی توڑنے کا قصہ اس کے بعد مسلسل کئی دنوں تک اور رشتہ داروں کو سنایا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے عطر کی شیشیوں سے نفرت ہوگئی۔ میں ہر شیشی کو توڑنا چاہتی تھی بلکہ ہر چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مجھے گھر کے کام سے نفرت ہوگئی۔ مجھے گندگی پسند آنے لگی اور میں اکیلی بیٹھنے لگی۔

میری سمجھدار امی! آپ کی بڑی تمنا تھی کہ میں تعلیم حاصل کروں، نیک عادتیں ڈالوں، اچھی باتیں سیکھوں۔ اس لئے مجھے سکول میں داخل کر دیا گیا۔ ''جھوٹ مت بولو''، ''بڑوں کا حکم مانو''، ''غریبوں پر رحم کرو۔''

سکول میں نئی نئی سہیلیاں مل گئیں اور میرا دل بہل گیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی نئی چیزوں کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ ایک روز آپ سے چار آنے پیسے بالوں کے پن خریدنے کے لئے مانگے۔ آپ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس کوئی نہیں۔'' میں خاموش ہوگئی۔ چند منٹ بعد چوڑیاں بیچنے والا آیا اور آپ نے ڈیڑھ روپے کی رنگ برنگی چوڑیاں خرید کر اپنی خوب صورت کلائیوں میں پہن لیں۔ میں حسرت سے اُن پیسوں کو دیکھ رہی تھی جو چوڑی والے نے جیب میں ڈالے اور دل میں سبق دہرا رہی تھی۔ ''جھوٹ مت بولو، جھوٹ مت بولو۔''

میرے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہونے لگا۔ میں آپ ہی کی طرح ماتھے پر بل ڈال کر اپنی بہنوں سے باتیں کرتی۔ سخت الفاظ استعمال کرتی۔ بہنیں میرا یہ لہجہ دیکھ کر ہنس دیتیں اور آپ کہتیں۔ ''باپ جیسی شکل اور اسی کی عادتیں پائی ہیں۔'' دادی اماں گھر آتیں تو آپ مجھ سے کہتیں۔ ''ذرا بتاؤ تو ابا گھر آ کر کس طرح بولتے ہیں؟'' میں آپ کو خوش کرنے کے لئے ناک بھوں چڑھا کر غصے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے بولتی، دادی اماں جل جاتیں مگر آپ خوش ہو جاتیں۔ میں اَبّا کو بھوت سمجھنے لگی۔

میں تقریباً ہر روز سکول دیر سے پہنچتی کیوں کہ میرے کپڑوں اور ناشتے کی طرف توجہ، اَبّا کے دفتر جانے کے بعد ہی ہوتی۔ میں ڈرتے ڈرتے گھر کے باہر قدم رکھتی۔ آپ اکثر سمجھاتیں کہ استانی سے کہہ دینا۔ ''اَبّا بیمار تھے''۔ ''سائیکل پنکچر ہو گئی تھی''۔ ''تانگا نہیں ملا تھا''۔ مگر سکول پہنچ کر میری زبان رُک جاتی اور مجھے سزا بھگتنا پڑتی۔

سات سال کی عمر میں میں اچانک سخت بیمار ہو گئی۔ بخار ٹوٹتا ہی نہ تھا میں بہت کمزور ہو گئی۔ ہر وقت پلنگ پر لیٹی رہتی تھی۔ میری پیاری امی! مجھے اپنی وہ بیماری کتنی عزیز تھی۔ آپ اور اَبّا ہر وقت میرے پلنگ کے پاس بیٹھے رہتے، میٹھی میٹھی باتیں کرتے، مجھے ہنسانے کی کوشش ہوتی۔ ہر صبح ایک نیا کھلونا میرے پاس دکھائی دیتا۔ بالوں کے پن، گلے کے ہار چوڑیاں۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ صرف آپ کی پریشان صورت دیکھ کر مجھے کوفت ہوتی۔ اَبّا اور آپ ایک دوسرے کو آرام کرنے کے لئے کہتے اور میں دونوں کے ہاتھ پکڑے رہتی۔ مجھے آپ کا ہاتھ پکڑنے سے کتنا سکون ملتا۔ کتنی ہمت حاصل ہوتی یہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری طاقت واپس آنی شروع ہوئی اور جس روز آپ دونوں نے میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے چلایا تو یوں معلوم ہوا جیسے میں نے کسی اذیت ناک خواب سے جاگ کر ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کے فطری تقاضے

ڈاکٹر نسیم شوکت

انسانی فطرت کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ چند بنیادی تقاضے وابستہ ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اس کی بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً خوراک، ہوا، پانی۔ ان چیزوں کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں انسان جسمانی طور پر مردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن چند ضرورتیں اور تقاضے ایسے بھی ہیں جو اس کی شخصیت کو تراشتے اور ڈھالتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ تشنہ رہ جائیں تو انسان کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ یہ تقاضے پیدائش سے اُس کے ساتھ ہوتے ہیں اور زندگی کے ہر دور میں اپنی تسکین کے لئے بے قرار رہتے ہیں لیکن زندگی کی جدوجہد میں وقت کے معاشی یا سیاسی تقاضے انسان کے فطری تقاضوں پر سبقت لے جاتے رہے ہیں۔ لہٰذا تاریخ کے ہر دور میں بچوں کو معاشرے کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے آلہء کار بنایا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں کی پرورش کے اصول معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کے تراشے گئے۔ سائنس کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ انسان خلاء کے راز فاش کر رہا ہے اور چاند تاروں پر آباد ہونے کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔ تو اس زمین پر ہم اتنی ترقی تو کر لیں کہ اس چاند میں بسنے والے کی پرورش کے اصولوں پر نظر ثانی اشد ضروری سمجھیں۔ دنیا کے اکثر حصوں میں تو بچوں کی جسمانی ساخت میں بھی معاشرے کے تقاضوں کے مطابق رد و بدل کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً پاکستان میں کئی ایک علاقے ہیں جہاں نوزائیدہ بچے کے سر کے پیچھے لکڑی کا ٹکڑا باندھا جاتا ہے تاکہ وہ چپٹا ہو جائے۔ افریقہ میں اب بھی کئی قبیلے ہیں جہاں ہونٹوں اور کانوں کو مسخ کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ چین میں ابھی چند سال پہلے رواج تھا کہ لڑکی کے پیروں میں پیدائش

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے وقت لکڑی کے جوتے پہنا دیئے جاتے تھے تا کہ اس کے پیر بڑھنے نہ پائیں۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بچے کی پرورش کا ہر وہ اصول جو بچے کی فطرت سے قطع نظر کر کے وضع کیا گیا ہے اس کی شخصیت مسخ کر کے بدنما بنا دیتا ہے۔ لہٰذا بچے کی تعلیم و تربیت کا لائحہ عمل تیار کرتے وقت اس کے فطری تقاضوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تقاضے کیا ہیں اور اُن کی تسکین کیسے کی جا سکتی ہے؟

بچے کی پیدائش سے پہلے ہی والدین و دیگر رشتہ دار اس کے بارے میں ایک خیالی تصویر قائم کر لیتے ہیں اور چونکہ یہ تصویر خیالی ہوتی ہے، لہٰذا حقیقت سے کوسوں دور بھی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ہر ہونے والے بچے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ لڑکا ہو۔ لڑکی کی پیدائش کا تصور ہی اکثر و بیشتر گھروں میں ناگوارِ خاطر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو۔ اس کی صحت مثالی ہو اور عادات قابلِ رشک ہوں۔ یہ تصور قائم کرتے وقت ماں باپ کے روپ رنگ، خدوخال کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ اب اگر نوزائیدہ بچہ اس خیالی تصویر کے مطابق نہ ہو تو یہ اس کی اوّلین بدقسمتی ہے۔ کیونکہ اُسے ایک ایسا ماحول ملے گا جو اس کی شخصیت کو ماننے اور تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کا پہلا فطری تقاضا یہ ہے کہ اس کو ایک فرد کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ یہی صورت حال سکول میں بھی پیش آتی ہے یعنی اساتذہ بھی اس بچے کو ہی منظورِ نظر بناتے ہیں جو اُن کے پسندیدہ تصوری خاکے کے مطابق ہو۔

زندگی کے اوّلین دَور میں بچہ چند احساسات میں گھرا ہُوا ہوتا ہے جن میں سے اکثر ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ مثلاً بھوک، پیشاب کی نمی، پیٹ کا درد وغیرہ۔ اس کی ماں اسے ان ناگوار احساسات سے نجات دلاتی ہے، بھوک کو دور کرتی ہے، چمکارتی ہے جس سے بچے کو آرام و سکون ملتا ہے۔ تھوڑے عرصے بعد ماں کی موجودگی ہی اس کو سکون پہنچانے کے لئے کافی ہے اور وہ اس کی شکل دیکھتے ہی رونا بند کر دیتا ہے۔ اس دورِ شیر خواری میں بچے کو ماں کی شفقت و محبت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا سارا جسم اس کے پیار کو محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا بچے کو گود میں لینے اور چمکارنے سے اس کی تسلی ہوتی ہے۔ ماں کے دودھ پر پلے ہوئے بچوں کو ماں کا قرب زیادہ نصیب ہوتا ہے اس لئے ان میں یہ خواہش کافی حد تک پوری ہو جاتی ہے لیکن بوتل سے دودھ پینے والے بچے ماں کے قرب سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اگر بوتل سے دودھ پلاتے وقت ماں بچے کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چمکارے اور گود میں لے تو اس طرح بچے کو اس کی محبت کی حدت پہنچ سکے گی اور یہ حدت اس کو مستقبل میں اضطراب اور بے چینی سے محفوظ رکھے گی۔ اس کے علاوہ دودھ کے مقررہ اوقات کی شدید پابندی بھی مناسب نہیں۔ بعض بچے خوراک جلد ہضم کر لیتے ہیں اس لئے وہ تین یا چار گھنٹوں کے وقفے سے قبل ہی بھوک سے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں، گھڑی کے مطابق چل کر انہیں دودھ سے محروم رکھنا مناسب نہیں۔ بھوک کی بے چینی اور مسلسل رونا بچے میں اس قسم کا اضطراب پیدا کر دیتا ہے جو ہمیشہ کے لئے اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ابتدا میں بچے کو بھوک لگنے پر دودھ دے دینا چاہئے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ یہ بچے بھی چند مہینوں میں معمول کے پابند ہو جاتے ہیں۔ دودھ چھڑاتے وقت بچے پر سختی یا اس میں خوف پیدا کرنا اس کی دماغی صحت کے لئے مضر ہے۔ اس دور میں مزید اظہار شفقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ماں کی اپنی شخصیت کا اثر بھی بہت دیر پا ہوتا ہے۔ بچے کے اس اوّلین دور پر جو تحقیق کی گئی ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ وہ لڑکی جو ماں بننے کے لئے دماغی طور پر تیار ہے وہ ماں کے سخت فرائض خوش اسلوبی و خود اعتمادی سے ادا کرے گی لیکن اگر وہ خود خوفزدہ یا مضطرب ہے، یا اظہار محبت سے گھبراتی ہے تو وہ بچہ میں بھی وہی خصوصیات پیدا کر دے گی۔ نفسیات کے متعدد ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ماں کے پیار سے محروم رہنے والے بچے ایک خاص قسم کی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ دنیا کو مشکوک نظروں سے دیکھیں اور مسلسل شاکی رہیں۔ اس کے برعکس وہ بچے جن کی مائیں انہیں پیار کرتے وقت گھبراتی نہیں بلکہ وہ اس میں فراخ دلی سے کام لیتی ہیں، سخی دل، خوش مزاج اور دنیا پر بھروسا کرنے والے انسان بنتے ہیں۔

والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے جلد از جلد اپنے پیشاب پاخانے پر قابو پالیں اور پاک صاف رہنا شروع کر دیں لیکن بچے کے لئے یہ سبق سیکھنا اتنا آسان نہیں۔ اس دور میں اس کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس پر بے جا جبر نہ کیا جائے اور ماں باپ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ دائمی قبض کی شکایت یا رات کو بستر پر پیشاب کرنے کی عادت، اصل میں اس دور کی سختی کا نتیجہ ہیں۔ والدین کو خاص طور پر یہ دھمکی نہیں دینی چاہئے کہ وہ بچے سے محبت کرنا چھوڑ دیں گے بلکہ بچہ جب جسمانی طور پر تیار ہو جائے گا تو خود بخود صاف رہنا شروع کر دے گا۔ اگر کبھی کبھار وہ بستر گیلا بھی کر دے تو ناراضگی اور غصہ اس کے احساسِ جرم میں مبتلا ہونے کا موجب ہوگا۔ اٹھارہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مہینے کی عمر تک بچہ جسمانی طور پر پیشاب پاخانہ پر قابو پانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بلا شرکتِ غیر ماں باپ کی توجہ کا مرکز بنا رہے۔ نئے بھائی یا بہن کی آمد سے اس خواہش کو چوٹ لگتی ہے۔ یہ نووارد بچے کے خیال میں ناخواندہ مہمان ہوتا ہے، اسے ماں باپ کی توجہ سے بری طرح محروم کر دیتا ہے۔ یہیں سے بہن بھائیوں میں رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت پہلا بچہ اگر نئے بچے کی پیدائش کے بارے میں سوال کرے تو اس کا جواب دینا چاہئے اور دو تین مہینے پہلے ہی سے اسے نئے مہمان کی آمد کی خبر دینی چاہئے، چنانچہ وہ اس کے آنے سے پریشان نہ ہوگا بلکہ اسے ایسا ہی انتظار رہے گا جیسے کہ ایک نیا کھلونا ملنے کا۔ اس کے علاوہ مزید اظہارِ شفقت اور تسلی بخش رویے سے بھی بچے کا اضطراب دور کیا جا سکتا ہے۔

تین چار سال کے بچے میں غصہ و طیش کے جذبات ہر لمحہ اظہار کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ وہ ان جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان سے خوش بھی ہو۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ان پر قابو پانا سیکھے اور اس کے بڑے ہی اپنے عمل اور رویے سے اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر نہ تو یہ مناسب ہے کہ بچے کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے غصے کا اظہار دل کھول کر اور ہر موقع پر کرے، اور نہ یہ بجا ہے کہ اُسے سزا دی جائے۔ ان دونوں طریقوں سے بچہ اور بھی غصہ کرنا سیکھتا ہے۔ مارنے پیٹنے اور سزا دینے سے تو عام طور پر یہ طوفان اور دُگنا ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ بچے کا خیال بٹا لیا جائے یا پھر اس کو سمجھایا جائے کہ یہ غصہ بے جا ہے۔ بعض دفعہ کھیل کے ذریعے بھی بچوں میں سے غصے کے جذبات کم کئے جا سکتے ہیں۔

بچے تذکیر و تانیث کے فرق کو بہت جلد محسوس کر لیتے ہیں لیکن اس فرق کے بارے میں ان کے ذہن میں پریشان کُن سوال پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ اپنے لڑکے یا لڑکی ہونے کی حقیقت کو قبول کرنے میں بھی ان کو دقت ہوتی ہے لیکن اگر ان کے سوالوں سے بڑے گھبرا کر ٹال مٹول سے کام نہ لیں اور معقول قسم کے جوابوں سے ان کی تسلی کر دیں تو بچے اپنی جنس کو قبول کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو یہی بچے مستقبل میں اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب و خوشگوار بنا سکیں گے کیونکہ اگر بچپن میں ہی لڑکی کو اپنی نسوانیت پر فخر کرنا نہ سکھایا گیا تو وہ بڑی ہو کر بیوی یا ماں کے فرائض بخوشی ادا نہ کر سکے گی۔

جب انسان نے گروہی زندگی شروع کی تو ذاتی ملکیت کے لئے چند قوانین بھی مرتب کئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ یہ شے زید کی ہے بکر کو نہیں لینی چاہیے۔ لہٰذا جب مُنے نے اپنی چھوٹی سی دنیا میں گھومنا پھرنا شروع کیا تو اس کے کانوں میں مسلسل اس قسم کی آوازیں آئیں۔ ''مُنے اسے ہاتھ نہ لگاؤ''۔ ''مُنے اس کے نزدیک نہ جاؤ''۔ ''یہ نہ کھاؤ''۔ ''وہ مت کرو''۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہر شے اور ہر انسان کے گرد ایک غیر مرئی دیوار کھنچی ہوئی ہے اور اس دیوار کو صرف خاص اوقات میں اور چند شرائط کے ساتھ پار کیا جا سکتا ہے۔ یہ شرائط اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ اس کا چھوٹا سا دماغ ان کے سمجھنے سے معذور رہتا ہے۔ لہٰذا وہ اکثر ہمسائے کے گھر سے سیب اٹھا لاتا ہے، دوکان پر کھلونا نظر آنے پر اس کو جیب میں رکھنے کی سوچتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اگر اس کو چور کہا جائے تو یہ سراسر زیادتی ہو گی، لیکن والدین کی ذمہ داری ہے کہ بچے کو اس قابل بنائیں کہ وہ جماعت کا فرد بن کے زندگی گزارے۔ لہٰذا اس دور میں بچے کا فطری تقاضا ہے کہ اس کو یہ سبق صبر و تحمل سے سکھایا جائے، نہ صرف یہ بلکہ والدین و اساتذہ کا مثالی عمل ان کے الفاظ سے زیادہ مؤثر ہو گا۔ اس کے برعکس اُن کا معمولی سا جھوٹ یا بے ایمانی بچے کے کردار کے لئے سمِ قاتل ہے۔

بچپن کے مختلف ادوار سے گزرتے وقت بچہ اپنے بارے میں کسی قسم کی رائے یا تصور قائم کرتا ہے۔ یہ رائے کسی حد تک والدین کی رائے سے اثر لیتی ہے۔ مثلاً ماں یا باپ تعریف یا مسلسل لعن طعن سے ظاہر کر دیتے ہیں کہ وہ بچے کو اچھا سمجھتے ہیں یا بُرا۔ لہٰذا بچے کا اپنا تصور بھی وہی رخ اختیار کرتا ہے۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ اگر یہ رائے اچھی ہے تو بچے میں تعمیری رجحانات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ امکانات یہ ہیں کہ وہ صاحب ایثار و بے نفس انسان بنے اور اس میں دوسروں کے لئے ہمدردی و دوستی کے جذبات پائے جائیں۔ اگر بدقسمتی سے یہ رائے بری ہے تو وہ بڑا ہو کر رقابت و دشمنی کی آگ کا شکار بنا رہے گا۔ بورسٹل جیل میں جرائم پیشہ لڑکوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوئی کہ ان کا اپنے بارے میں تصور بُرا تھا۔ ہر بچے کا تقاضا ہے کہ اس کے تعمیری رجحانات کو بیدار کیا جائے اور اس کی اپنی ذات کے بارے میں رائے خراب نہ ہو۔ بے جا لاڈ پیار اور مسلسل ڈانٹ ڈپٹ دونوں رویے ایسے ہیں جو بچے کے لئے مضر ہیں۔ اسے پُرسکون اور محفوظ زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس کے بزرگ مستقل مزاج و ثابت قدم ہوں جو اس کے ساتھ ہمدردی اور شفقت سے پیش آئیں۔ اگر وہ خود مضطرب ہے تب بھی بڑے لوگ مطمئن نظر آ رہے ہوں اور اُن کے ہر عمل سے یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ اگر بچے نے کوئی بات بُری کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے تو وہ فعل بُرا ہے بچہ بُرا نہیں۔ اُسے کسی صورت میں بھی یہ خیال نہ ہو کہ وہ حقیر یا غیر مطلوب ہستی ہے۔ اگر وہ غلط کام کرے تو اس پر یہ واضح کر دیا جائے کہ غلط ذرائع استعمال کرنے سے انسان کامیاب نہیں ہوتا۔ یہاں یہ کہنا مناسب نہیں کہ تم نکمے ہو اب امی تم سے محبت کرنا چھوڑ دے گی۔ ڈر اور خوف سے سیکھے ہوئے سبق بچے کی شخصیت میں جذب نہ ہو سکیں گے۔ یہ بات اشد ضروری ہے کہ اس کے صحیح عمل کو سراہا جائے اور اس کی خوب تعریف کی جائے۔ ہم خواہ کتنے بڑے ہو جائیں کوئی اچھا کام کرنے کے بعد ہمارا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس کی قدر دانی کرے، بچے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

کسی ملک کی ترقی کے لئے صنعتی ترقی نہایت اہم ہے لیکن اس سے بھی اہم یہ حقیقت ہے کہ اس کے لوگ اعلیٰ کردار و بے داغ شخصیتوں کے مالک ہوں، اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اپنے بچوں کی پرورش اُن کے فطری تقاضوں کو مدنظر رکھ کے کریں۔ بچوں کے فطری تقاضے ہی دراصل ملک و قوم کے تقاضے ہیں۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والدین، سکول اور معاشرہ

پروفیسر صوفی گلزار احمد

والدین اور اساتذہ کا اشتراک ایک نہایت اہم تعلیمی تقاضا ہے۔ اگر والدین اساتذہ کا ہاتھ نہ بٹائیں اسکول کا کام ادھورا رہتا ہے۔ یہ بات مُسلّم ہے کہ گھر کا ماحول اور والدین کا بچوں کے ساتھ روّیہ، دونوں بچوں کی سیرت و کردار کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ اس لئے والدین کو اس بات کا احساس دلانا اور انہیں ادائے فرض کے لئے آمادہ کرنا عوامی تعلیم اور سوسائٹی کی بہبودی کے نقطۂ نظر سے اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بذاتِ خود بچوں کی تعلیم ___ اگر غور سے دیکھا جائے تو والدین بھی ایک طرح کے اُستاد ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں والدین کی کوششوں کو سراہا جائے اور انہیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس دلایا جائے۔ پڑھے لکھے والدین اسکول کی تعلیم میں اساتذہ کا ہاتھ بخوبی بٹا سکتے ہیں اور اس مشکل اور کٹھن مرحلے میں اس کے لئے آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ والدین تعلیمی پروگرام کی کامیابی کے پورے طور پر ضامن بھی بن سکتے ہیں۔ عہدِ حاضرہ کے اسکول روز بروز گھر اور اسکول کے بڑھتے ہوئے باہمی رشتے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ غرضکہ اساتذہ کا والدین کے ساتھ مل جُل کر کام کرنا تعلیمی نظام کا ایک اہم جُزو بن گیا ہے۔

والدین کا اسکول کے متعلق نظریہ

موجودہ زمانے میں والدین روز بروز اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں بڑی ہوشیاری اور مستعدی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اب یہ کہتے ہوئے نہیں سنا جاتا کہ ان کو تعلیم دینا اسکول کا کام

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔اب سے کوئی ایک نسل پہلے والدین اسکول کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے تھے۔اساتذہ کے کندھوں پر تعلیم کا سارا بوجھ لاد دیا جاتا تھا اور والدین اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتے تھے۔ چنانچہ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں اسکول اور گھر دو مختلف جگہیں خیال کی جاتی تھیں۔اساتذہ اور والدین دونوں میں یہ احساس پایا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق رہ کر اپنا اپنا کام بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں والدین بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کافی تجربات حاصل کر رہے ہیں۔ اب بچوں کے مسائل کے بارے میں اُن میں کافی غور و خوض کا مادہ پیدا ہو چکا ہے۔بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے سلسلے میں انہیں ریڈیو، فلموں، اخباروں اور لٹریچر کے ذریعے علم کا ذخیرہ حاصل ہو رہا ہے۔غرضکہ وہ مختلف ذرائع سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق مفید مواد حاصل کر رہے ہیں، اور اُن کے ذہن میں اُن کی تربیت کے متعلق مختلف خیالات وارد ہو رہے ہیں اور نئے نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں مثلاً ہم بچے کے ساتھ کیا سلوک کریں کہ وہ دوسرے افراد کے ساتھ آسانی سے مطابقت پیدا کر سکے۔گھر میں کون کون سی ذمہ داریاں اُس پر عائد کی جاسکتی ہیں؟ وہ کون سے ذرائع ہیں جن کی مدد سے گھر بچے کی اسکول کے ساتھ بخوبی مطابقت پیدا کر سکتا ہے۔

والدین کو اس بات کا پورا پورا علم ہے کہ بچے جس قسم کے ماحول میں رہتے ہیں وہ اُن کے کردار اور سیرت کی تعمیر میں نمایاں اثر ڈالتا ہے۔اگر بچوں کی نشوونما کے لئے حالات سازگار ہوں اور انہیں موافق ماحول میسر آجائے تو اُن پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔والدین کو اب اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ گھر اور اسکول کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنا چاہئے۔دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر کوئی احسن کام سرانجام نہیں دے سکتے۔اسکول اور گھر دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔جب دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر بچے کے تعلیمی نظام کی تعمیر کرتے ہیں تو بچے کی جسمانی اور ذہنی نشوونما پر کافی اچھا اثر پڑتا ہے۔بچے کے معمول کے مطابق بڑھنے پھولنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ والدین اور اساتذہ بچے کی نشوونما اور بڑھنے پھولنے کے اساسی اعمال یا قوانین کا بخوبی علم رکھیں۔

اگرچہ اُن والدین کی تعداد میں جو اسکول میں دلچسپی لیتے ہیں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر بھی بہت سے والدین ایسے ہیں جو والدین اور استاد کے گہرے رشتے سے بالکل ناواقف ہیں،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور بہت سے والدین کا اب تک یہ نظریہ ہے کہ بچے کی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ استاد بچے کی ذہنی نشوونما کی طرف توجہ دے سکتا ہے، جبکہ والدین اُس کی جسمانی اور اخلاقی نشوونما کی طرف بخوبی توجہ دے سکتے ہیں۔ عموماً ایسے والدین اعتماد سے نہیں کہہ سکتے کہ بچے کی جذباتی اور سماجی نشوونما کا کون ذمہ دار ہے۔ انہیں اس بات کی بالکل خبر نہیں ہوتی کہ والدین اور اساتذہ دونوں بچے کی نشوونما میں برابر کے حصے دار ہوتے ہیں اور موجودہ دور کا اسکول بچے کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کو متاثر کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

والدین کا ایک اور گروہ بھی ہے جن کے اسکول کے زمانے کے تجربات نہایت خوشگوار تھے۔ اساتذہ کے ساتھ اُن کی مطابقت بالکل نہیں تھی اور ان اساتذہ کے بارے میں جو رویّہ انہوں نے اختیار کیا وہ جوان ہونے کے بعد تک برقرار رہا۔ ایسے والدین کے نزدیک استاد ایک حاکم ہوتا ہے جو حکم دینے کا مجاز ہے اور حکم کی بجا آوری نہ کرنے پر شاگردوں کو سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ استاد کے لئے اُن کے دل میں کوئی کشش نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اُن کے لئے مہربان اور مشفق دوست بن سکتا ہے۔ وہ اپنا نقطہء نظر اُسی صورت بدل سکتے ہیں کہ وہ اساتذہ کو اپنا دوست اور رفیق سمجھیں اور اُن کی ذات میں دلچسپی لیں۔ اساتذہ کو چاہئے کہ وہ ایسے والدین کو یہ احساس دلائیں کہ وہ اُن کے گہرے دوست اور رفیق ہیں اور انہیں اپنے استاد ہونے کا بالکل احساس نہ دلائیں اور اُن کے روبرو تحکمانہ رویّے سے کام نہ لیں۔

والدین کا ایک اور گروہ تعلیم کو ایک میکانکی عمل تصور کرتا ہے۔ وہ تعلیم و تدریس کو محض رٹا لگانا ہی خیال کرتا ہے۔ یعنی طالب علموں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ درسی کتابوں سے مواد لے کر اپنے ذہنوں میں بھر لیتے ہیں۔ ایسے والدین کے نزدیک تعلیم و تدریس کوئی فن کا درجہ نہیں رکھتی اور نہ ہی اساتذہ کے متعلق اُن کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے راہنما اور قائد ہیں جو بچوں کی صلاحیتوں کی نشوونما میں بڑا اہم حصہ لیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں تعلیم و تدریس کا کام ہر شخص سرانجام دے سکتا ہے۔ وہ اسکول کے نظم و نسق کے متعلق بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تدریس کے متعلق کیا کیا قواعد اور ضابطے مقرر ہیں۔ ایسے والدین کو تعلیمی مسائل کے بارے میں روشناس کرانے کے لئے کسی خاص طریق کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اُنہیں اسکول کے ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے مواقع مہیا کئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائیں۔ جب انہیں براہِ راست اسکول کے نظم ونسق اور تعلیم وتدریس کے طریق ہائے کار کو دیکھنے کا موقع ملے گا تو انہیں یہ بخوبی پتہ چل جائے گا کہ اسکولوں میں اُن کے وقت سے لے کر کون کون سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

بعض والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسکول آنے سے بہت کتراتے ہیں۔ اُس کی وجہ دراصل یہ ہوتی ہے کہ بچپن میں اساتذہ اُن کے دل میں اپنی ذاتی برتری کا اتنا شدید احساس پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو حقیر اور کمتر خیال کرنے لگتے ہیں۔ یہ احساس کمتری بڑی عمر میں پہنچ کر ایک ذہنی اُلجھن کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ استاد اُن کے نزدیک علم وفضل کا مالک ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہوا بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے استاد کو والدین میں اعتماد پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن میں یہ احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ آخر کار وہ بھی معاشرے کے معزز افراد ہیں۔ اُن پر بھی معاشرے کی چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جنہیں پورا کرنا اُن کا فرض اوّلیں ہے۔ انہیں اس بات سے روشناس کرانا ضروری ہوتا ہے کہ استاد کے ساتھ ساتھ والدین بھی بچوں کی تعلیم وتدریس کے معاملے میں برابر کے حصے دار ہیں۔ ایسا کرنے سے والدین کی نگاہوں میں اُن کی عزت بڑھ جائے گی۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، والدین کا اسکول کے بارے میں جو بھی نظریہ ہو، اساتذہ کو ہمیشہ بچوں کی ذات میں دلچسپی لینی چاہئے اور اُن کی بہتری اور بہبودی کی تدابیر سوچنی چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ والدین کا چونکہ سکول کے بارے میں روّیہ ہمیشہ تنقیدی ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی خیال کرتے ہیں کہ اسکول کا روّیہ اُن کے مسائل کے ساتھ ہمدردانہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ نقطۂ نظر اُنہیں کبھی اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ وہ ایک رفیق کی صورت میں استاد کا ہاتھ بٹائیں اور بچوں کے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں اُن کے مدد ومعاون ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اساتذہ کو چاہئے کہ وہ والدین کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ وہ بھی بچے کی بہتری وبہبودی کے لئے کوشاں ہیں اور اُن کے اپنے گھریلو مسائل اتنے بے شمار ہیں کہ اُن کے حل کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے وہ والدین کے دل میں دوستی اور رفاقت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں اور اس رفاقت کی بدولت وہ بچوں کے تعلیمی مسائل کا صحیح حل تلاش کر سکتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسکول کے متعلق والدین کے یہ تمام روّیے، والدین کے ساتھ مل جُل کر کام کرنے کے سلسلے میں اتنے بنیادی ہیں کہ اسکول، والدیؔن کے اُن جذباتی تجربوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا جو انہوں نے بچپنے میں اسکول میں حاصل کئے تھے۔ والدین کو اسکول بلانے کا مقصد محض یہ نہیں ہوتا کہ اُن سے ملاقات کی جائے بلکہ بہت سے تعلیمی مسائل حل تلاش کیا جائے۔ والدین کی مدد سے بہت سے تعلیمی مسائل آسانی سے سُلجھائے جاسکتے ہیں۔ اساتذہ کے ساتھ والدین کے آزادانہ میل جول سے یہ آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ والدین کی دلچسپیاں اور مشاغل کیا ہیں۔ اُن کی فطری استعداد کیا ہے؟ اور یہ معلومات بچوں کی تعلیم و تدریس کے معاملے میں کافی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر اساتذہ، والدین کو یہ موقع دیں کہ وہ اہم تعلیمی معاملات میں اپنے مشورے دیا کریں تو پھر والدین اپنی خوشنودی سے اسکول میں آنا شروع کردیں گے اور اس طرح اُنہیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہوجائے گا۔ اور وہ یہ بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ بالخصوص اپنے بچوں کی تعلیم اور بالعموم تمام قوم کے بچوں کی تعلیم کے معمار اور محافظ ہیں۔

تعلیم کے اہم معاملات میں حصہ لینے سے والدین کو بخوبی تسکین مل جائے گی اور جوں جوں تعلیمی مسائل میں نئے نئے افق رونما ہوں گے، والدین بھی اپنی پوری کوشش اور تن دہی سے اُن نئے مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش نظر آئیں گے۔

والدین کے متعلق اسکول کا نظریہ

اساتذہ کا والدین کے متعلق روّیہ۔ ایک ضروری سوال جو گھر اور اسکول کے باہمی تعاون کے سلسلے میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسکول والدین کے متعلق کیا روّیہ رکھتا ہے۔ کیا اساتذہ والدین کا خیر مقدم کرتے ہیں اور تعلیمی تجاویز اور پروگرام کے بارے میں اُن کی مدد کے خواہاں ہیں؟ یا کیا اسکول والدین کو اپنے سے بالکل علیحدہ رکھتا ہے اور ان سے بس یہی توقع رکھتا ہے کہ وہ اسکول کی کارکردگی کو دیکھیں؟

عہد حاضرہ کے اکثر اسکولوں میں والدین اساتذہ کے ساتھ برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔ وہ اسکول کے مختلف مشاغل میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ یہ مشاغل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ جماعت میں نہیں بلکہ کھیل کے میدان میں بھی وہ بڑی مستعدی دکھاتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کے ساتھ آزادانہ میل جول سے بعض اوقات اسکول کے روزمرہ کام کاج میں بھی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

اکثر اسکول والدین کو، خاص طور پر اجازت دے دیتے ہیں کہ وہ اسکول آئیں اور اسکول کے کام کاج کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اکثر اوقات انہیں کسی کھانے یا چائے پر مدعو کیا جاتا ہے یا کسی بچے کی بُری رپورٹ کے سلسلے میں انہیں بلایا جاتا ہے یا اسکول کی کسی میٹنگ میں کسی اچھے مقرر کو سننے کے لئے انہیں مدعو کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد کھانے یا چائے کی میز پر اساتذہ اُن کے ساتھ بچوں کی تعلیم کے بارے میں اہم معاملات پر بحث کرتے ہیں اور اُن کی رائے بھی لی جاتی ہے۔

اس تمام میل ملاپ میں والدین اسکول کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تجربات والدین کے لئے کافی تسلی بخش ہوتے ہیں۔ مزید بریں یہ سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا اس قسم کے تجربات والدین اور اسکول کے باہمی رشتے کو تقویت دیتے ہیں یا نہیں، اور کیا یہ تجربات بچوں کی ضروریات کو سمجھنے میں بخوبی مدد دیتے ہیں؟

ان تمام باتوں کے سلسلے میں کچھ سوالات ذہن میں ضرور پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ والدین کا اسکول میں جانا کیوں ضروری ہے؟ کیا اساتذہ کو بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں تنخواہیں نہیں دی جاتیں؟ اگر اساتذہ کو تعلیم کے عوض معاوضہ دیا جاتا ہے تو پھر والدین کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ عہد حاضرہ میں جبکہ اساتذہ کے کندھوں پر کام کا کافی بوجھ ہے تو پھر والدین اور معاشرے کو کیوں ان کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے مقاصد کا جائزہ لیں اور اُن کی کارکردگی کو دیکھیں۔ ذرا پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ موجودہ دور کی تعلیم و تدریس بچوں کی نشوونما سے بخوبی سروکار رکھتی ہے اور اسکول اور گھر دونوں بچے کے تجربات کے حصول میں مدد دیتے ہیں، اور ان تجربات کا حصول اُس وقت تک رہتا ہے جب تک والدین اور اساتذہ ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اسکول اس بات کا زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ کام کرے اور بچوں کی نشوونما کے سلسلے میں مدد دے۔ ان تمام باتوں میں ایک دوسرے کا صلاح مشورہ اور رہنمائی شامل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی تعلیمی پروگرام پختہ بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا۔ والدین سے کام لینے کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ بعض اسکول والدین کو محض مشاہدہ کرنے والا ہی خیال کرتے ہیں اور بعض اسکول انہیں اسکول میں اساتذہ کے برابر کا درجہ دے دیتے ہیں، اور اُن

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی اُسی طرح تعظیم کی جاتی ہے جس طرح اساتذہ کی۔ بہر حال والدین کو اسکول میں جو بھی رتبہ دیا جائے۔ اگر اُن کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اُنہوں نے نمایاں کام سرانجام دینا ہے، اور اس کی تمام تر ذمہ داری اُن پر عائد ہوتی ہے تو بے شک اسکول کو بے حد فائدہ پہنچے اور اچھے نظام تعلیم کی تشکیل ہو۔

اساتذہ کے باہمی تعلقات

پیشتر اس کے کہ والدین اسکول میں داخل ہوں اور اس کے تعلیمی نظام کا جائزہ لینے لگیں۔ اسکول کے منتظمین کا یہ فرض ہے کہ وہ اساتذہ، ہیڈ ماسٹر اور منتظم کے باہمی تعلقات کا بخوبی جائزہ لے رکھیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ اور بچوں کے باہمی تعلقات کو بھی بخوبی نگاہ میں رکھیں۔ والدین کو اسکول دکھانے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اسکول کی طرف دھیان دیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ دکھانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ اب جبکہ انسانوں کے باہمی تعلقات کا خوشگوار ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ پیشتر اس کے کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کیا جائے اور اس طرح فائدہ پہنچے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ایک اسکول کے معاشرے میں مختلف گروہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے ہیں یا نہیں، اسکول کا نظام یا تو اچھا چل رہا ہوتا ہے یا وہ اچھا نہیں چل رہا ہوتا۔ ان دونوں حالتوں میں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ لوگ کس قدر ذمہ داری سے اپنا اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اساتذہ کو اپنے کام میں کسی قسم کے خطرے سے محفوظ سمجھنا چاہیے۔ مزید بریں اساتذہ کو افسر بالا کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی محفوظ خیال کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہیں بچوں کے ساتھ کام کرنے میں مسرت محسوس کرنی چاہیے۔ اور جس کام کو وہ سرانجام دے رہے ہوں اس میں اُن کا مطمئن ہونا ضروری ہے۔ بعینہ اسکول کے افسر بالا کو بھی یہ احساس ہونا ضروری ہے کہ اساتذہ اس کے وفادار ساتھی ہیں اور اسکول کا پورا نظام اس کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ اسکول کے اساتذہ ہیڈ ماسٹر اور منتظم کو اس بات کا خیال ہونا چاہیے کہ اپنی چار دیواری سے نکل کر معاشرے کے ساتھ میل جول پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے، اور اگر یہ چیز پیدا ہو جائے تو پھر اساتذہ اور والدین کے رشتے باہمی تعاون اور محبت و شفقت پر استوار ہو جاتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والدین کے پروگرام کا دائرۂ عمل

والدین کے ساتھ میل جول کی ابتدا بہت بے تکلفی سے ہونی چاہئے کیونکہ تھوڑے عرصے میں جب والدین اور اساتذہ باہم مل جل کر کام کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں تو پھر کارکردگی خود بخود جاری رہتی ہے اور کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس کے علاوہ اسکول کے بہت سے مسائل جو مشترکہ دلچسپی رکھتے ہیں، منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ جوں جوں والدین کی کارکردگی کے ساتھ اس تعلیمی پروگرام کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اساتذہ اور والدین دونوں کی یہ باہمی کوشش کہ بچوں کے لئے کوئی اچھا تعلیمی پروگرام مرتب کیا جائے، اسکول اور گھر میں مضبوط رشتہ قائم کر دیتی ہے مثلاً ایک اسکول نے والدین کے ساتھ کام کاج کی وسعت کو بیان کرتے ہوئے چار بنیادی مقاصد کا خاکہ کھینچا ہے۔ جو ان مشاغل کے وسیع مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں:

1- عام تعلیمی مقاصد، عام تعلیمی پالیسی اور ہدایاتی طریق ہائے کار کے بارے میں اُن لوگوں کے لئے اطلاعیں اور خبریں تیار رکھنا جو ان میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

2- والدین کو یہ بتانا کہ بچے کی تعلیم و تدریس پیدائش سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور پھر تعلیم و تدریس کا عمل شروع رہتا ہے۔ خواہ بچہ گھر میں موجود ہو یا اسکول میں۔ سینما گھر میں ہو یا کھیل کے میدان میں۔

3- والدین پر اس حقیقت کو آشکار کرنا کہ بچے کی صحت اور اُس کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کی تمام تر ذمہ داری میں اسکول اور والدین ہی برابر کے شریک نہیں ہوتے بلکہ پورا معاشرہ اور اس معاشرے کا ہر شعبہ جو اس کی حدود میں آتا ہے، برابر کی شرکت رکھتے ہیں۔

4- والدین کو تعلیمی پروگرام کے متعلق پورا پورا اعتماد دلانا اور خصوصاً اُن لوگوں کے متعلق اعتماد پیدا کرانا جو اس تعلیمی پروگرام کے سربراہ ہوں۔

اوّلین مقصد وہ ہے جس پر مدارس عموماً بہت زور دیتے ہیں۔ اسکول کی پالیسی تعلیمی پروگرام اور مختلف قسم کے مشاغل کے متعلق اطلاعات والدین اور معاشرے کے دیگر افراد مختلف ذرائع سے حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اسکول کے ایک منتظم کو اساتذہ کے باہمی تعاون سے ایک اچھا منظم

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور باقاعدہ پروگرام تیار کر لینا چاہئے جس کے تحت عوام کو اسکول کی باقاعدہ خبریں ملتی رہیں اور انہیں اسکول کے ہر پروگرام کی لحہ بہ لحہ خبر رہے۔ ایک بات ضرور ہے کہ اگر اسکول کا یہ پروگرام والدین کو اطلاعات دینے کے ساتھ ساتھ اور کچھ نہیں کرتا تو یہ یقینی امر ہے کہ والدین اسکول کے ساتھ اپنا رشتہ استوار نہیں کر سکیں گے، بلکہ دوری محسوس کریں گے۔ وہ افراد جو چھپی ہوئی اطلاعات اور خبروں پر اعتماد نہیں رکھتے، وہ اسکول کے تعلیمی پروگرام کے متعلق کوئی علم حاصل نہیں کر سکتے۔ بہت کم والدین ایسے ہوتے ہیں جو اسکول کے تعلیمی پروگرام کا کچھ علم رکھتے ہوں اور پھر وقت پڑنے پر اس تعلیمی پروگرام میں سرگرمی سے حصہ لیں۔ چنانچہ اُن میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اور بہت سے ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسکول کو والدین کے لئے مواقع مہیا کرنے چاہئیں کہ وہ بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے متعلق علم حاصل کر سکیں۔ اسکول کے اساتذہ اور والدین دونوں بچوں کو دیکھنے جانے اور اسکول اور گھر دونوں جگہ تعلیمی راہنمائی کے اصولوں پر بحث و مباحثہ سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ بعض مدارس میں خوش قسمتی سے اساتذہ کے سٹاف میں والدین میں سے ایک خاص استاد مقرر ہوتا ہے، جو (Study Group) تعلیمی مطالعہ کے گروہوں اور والدین کی راہنمائی کو منظم صورت دیتا ہے۔ بعض دیگر مدارس جن میں والدین میں سے کوئی خاص تعلیمی نگران مقرر نہیں کیا جاتا اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحبان بذاتِ خود والدین کے ساتھ کام کرنے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتے ہیں۔ بہت سے والدین کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بچوں کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ ایسے حالات میں انہیں اپنی خواہش کی تسکین کا موقع مل جاتا ہے۔ اس طرح جب انہیں بچوں کی فطرت کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بچوں میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

تیسرا مقصد جو والدین اور اساتذہ کے تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں بہت اہم پہلو کی حیثیت رکھتا ہے وہ ہے معاشرے کے اُن کارکنوں کے ساتھ رابطہ اور واقفیت رکھنا جو بچوں اور والدین کے حقوق کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اکثر اوقات والدین اپنے معاشرے کے ایسے کارکنوں کے متعلق جن کی وہ مدد لے سکتے ہیں بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ بعض مدارس اس سلسلے میں والدین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ مل کر سیر و سیاحت کی پارٹیاں بنا لیتے ہیں۔ بعینہٖ والدین بھی بچوں کو عجائب گھر، آرٹ گیلریوں یا لائبریریوں میں لے جانے کے سلسلے میں اساتذہ کا ہاتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بتاتے ہیں۔ ایسا کرنے سے والدین اور اساتذہ دونوں معاشرے کے وسائل کے متعلق واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کا باہمی تعلق اس مقدمے کے پیشِ نظر ترتیب دیا جاتا ہے کہ ''اپنے معاشرے کو پہچانو۔'' اور پھر معاشرے کے مختلف مقامی کارکنوں کی خدمات کا بخوبی جائزہ لیا جاتا ہے اور جب والدین کو اپنے بچوں کے متعلق اُن کارکنوں کی خدمات کے فوائد کا پتا چلتا ہے تو وہ ان خدمات کو دوسرے بچوں کے لئے بھی فائدہ مند خیال کرنے لگتے ہیں، اور اس طرح معاشرے کی تمام تر تعمیر میں اُن کارکنوں کی شرکت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

چوتھا مطمح نظر یہ ہے کہ والدین کا اعتماد حاصل کیا جائے اور اسکول کے تعلیمی پروگرام میں اُن کا تعاون حاصل کیا جائے اور یہ مقصد اُسی صورت حاصل ہو سکتا ہے جب اساتذہ اور والدین کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہوں، اور یہ تعلقات اُن باتوں پر استوار ہوں جن کا اُوپر تین پیروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ جب ملازمین کو اسکول کے متعلق مکمل اور براہِ راست واقفیت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور انہیں بچوں کا مطالعہ کرنے اور مختلف تعلیمی مشاغل میں پورا پورا حصہ لینے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو وہ قدرتی طور پر اسکول کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور اسکول میں اُن کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اسکول کو والدین کے ساتھ ہی مل جل کر کام نہیں کرنا چاہئے بلکہ والدین کے علاوہ معاشرے کی دیگر جماعتوں کے ساتھ اس کا اشتراک ضروری ہے کیونکہ تمام شہری اسکول کے تعلیمی مشاغل میں برابر کے حصے دار ہوتے ہیں۔ ان تمام مقاصد کی واقفیت اور سوجھ بوجھ جس کے لئے اسکول کوشاں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ والدین اور دیگر افراد کے لئے یہ مواقع بہم پہنچانا کہ وہ اسکول کے اساتذہ کے ساتھ مل جل کر کام کریں۔ یہ تمام باتیں تعلیم و تدریس کے سلسلے میں بڑی اہم ہیں اور عوام کی کارکردگی کا جہاں تک تعلق ہے اس ضمن میں یہ بڑی اہم ہیں۔ معاشرہ اس قسم کے مدارس فراہم کر کے یقینی طور پر بڑا سکون اور روحانی تسکین حاصل کرتا ہے۔

والدین اور اساتذہ کے باہمی میل جول سے جو پروگرام ترتیب دیئے جاتے ہیں وہ مقاصد اور ضرورت کے لحاظ سے مذکورہ بالا پروگرام سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ مقاصد خواہ کچھ بھی ہوں۔ دراصل وہ اُن تمام تجاویز، تبصروں اور خیالات پر مبنی ہونے ضروری ہیں جو والدین اپنے بچوں کے تعلیمی مفاد کے سلسلے میں روا رکھتے ہیں۔ مزید بریں یہ تمام پروگرام معاشرے کی دلچسپیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ضرورتوں کے عین مطابق ہونے چاہئیں۔

اسکول کی آسائش

والدین اور اساتذہ کے خوشگوار باہمی تعلقات کی بنا پر جو تعلیمی پروگرام بنائے جاتے ہیں اس ضمن میں اسکول کا بہت نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ موزوں جگہ اور عمارت کی آسائشیں مہیا کرتے ہیں۔ جب تک کہ والدین کے مشاغل کے لئے مناسب جگہیں نہ ہوں اُن میں یہ احساس کبھی پیدا نہیں ہوسکتا کہ اُن کی بھی کہیں ضرورت ہے اور لوگ اُن کی موجودگی کے متمنی ہیں۔ اگرچہ اکثر ماہرینِ تعلیم اس بات پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ اسکول کی عمارتیں ایسی ہونی چاہئیں جن میں بچے، نوجوان اور عمر رسیدہ لوگ بھی سما سکیں اور اپنا اپنا کام صحیح طور پر سرانجام دے سکیں۔ لیکن اس سلسلے میں بہت کم عمل درآمد ہوا ہے اور مستقبل کی بہتری و بہبودی کو بہت کم ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔

مدارس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ والدین کی اسکول میں موجودگی بہت ضروری اور اہم حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اساتذہ کو چاہئے کہ وہ والدین کے مختلف مشاغل کے سلسلے میں بہت کم آسائشوں کو قبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ والدین اور اساتذہ کی باہمی مجالس اگر محض اسکول کے کمروں یا صحنوں میں کی جائیں تو وہ خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرسکتیں جو اُن آرام دہ اور دلآویز کمروں میں خوشگوار نتائج پیدا کرسکتی ہیں جو والدین کے لئے خاص طور پر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا بہت زیادہ مصروف دفتر بھی والدین کے روزمرہ کام کاج میں مخل ہوسکتا ہے۔ ایک ایسی مجلس جو کسی اندھیرے کمرے میں کی جائے یا اسکول کے کسی ایسے کمرے میں جو بچوں کے بیٹھنے کے لئے ہی موزوں ہو، اُس سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ والدین کو کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں، کیونکہ اسکول میں والدین کے لئے مناسب جگہوں کا قیام دراصل اس بات کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ یہاں والدین کی بڑی عزت کی جاتی ہے اور انہیں بلند مقام حاصل ہے۔

اب جبکہ اسکولوں کے لئے نئی عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں یا اسکولوں کی پرانی عمارتوں کو نئی شکل دی جارہی ہے اس بات کا ہر لحظہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ والدین کو مناسب آسائشیں میسر ہوں اور انہیں اسکول کے مختلف مشاغل میں برابر کا شریک کیا جائے۔ دورِ حاضرہ میں اسکول کی تعلیمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرگرمیوں کے سلسلے میں جونئی تجاویز رکھی جاتی ہیں اُن میں والدین کی آسائشوں کا خیال بھی رکھا جاتا ہے اور اس سلسلے میں والدین اور اساتذہ دونوں کے کام کاج کے لئے مناسب کمرے ہونے ضروری ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں اخراجات کے لئے فنڈ بھی مہیا کیے جاتے ہیں اور اس فنڈ میں روپوں کی مقدار دراصل والدین کی تعداد اور اُن مختلف مشاغل پر مبنی ہوتی ہے جو والدین اسکول کے وسیع احاطے میں جاری رکھنا چاہتے ہوں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل سفارشات کی گزارش کی جاتی ہے:

1- اسکول میں والدین کے لئے ایسی جگہ متعین ہونی چاہئے جس میں داخل ہونے کے لئے علیحدہ دروازہ ہو اور وہ اسکول سے ذرا الگ تھلگ ہو۔

2- اس احاطے میں اتنی وسیع جگہ ہونی چاہئے کہ چالیس نوجوان افراد اس میں بخوبی بیٹھ سکیں اور رسمی طور پر مجلس کر سکیں اور اس کے علاوہ اس سے دوگنے آدمی مشاغل کے سلسلے میں صحبت کر سکیں۔

3- بیٹھنے کے لئے آرام دہ جگہیں ہوں۔ روشنی کا مناسب انتظام اور سماعت کا بخوبی لحاظ رکھا جائے۔ گرمی پہنچانے کا انتظام ہو اور کمروں کی اعلیٰ زیبائش ہو۔

4- والدین اور اساتذہ کی مجالس کے مواقع مہیا کیے جائیں جن میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔

5- ایک لائبریری کا کمرہ جس میں کتابوں کے ذخیرے کی جگہ مہیا ہو اور پڑھنے کے لئے میز بھی دستیاب ہو۔

6- مختلف قسم کی تصاویر، پمفلٹوں، چارٹوں اور دیگر نمائشی چیزوں کو دکھانے اور اُن کا ذخیرہ کرنے کے لئے جگہ فراہم کی جائے۔

7- ریڈیو اور گراموفون مہیا کیے جائیں۔

8- ایک بلیک بورڈ اور دوسرے ٹیک بورڈ (Teak Board) کے لئے جگہ فراہم کی جائے۔

9- منہ ہاتھ دھونے اور صفائی کے لئے آسائشیں مہیا کی جائیں۔

10- اسکول کی عمر سے پہلے کے بچوں کے لئے عمارت کے اندر اور باہر کھیل کے میدان مہیا کیے جائیں۔

11- کھانے پینے اور چائے کے لئے چھوٹا سا باورچی خانہ ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موجودہ حالات میں جبکہ بہت سی اسکول کی عمارتوں میں طالب علموں کا بے پناہ ہجوم ہے اور بچوں اور اساتذہ کے کام کاج کے لئے سازگار حالات بہت کم میسر ہیں۔ والدین کو کام کرنے کے مواقع مہیا کرنا ایک نازک مسئلہ بن گیا ہے۔ والدین کو ان حالات میں کام کرنے کا موقع دینا، اساتذہ اور افسرانِ بالا کے لئے کافی ذہنی کوفت کا باعث ہے۔ تاہم اگر عقیدہ یہ ہو کہ والدین اسکول کے تعلیمی پروگرام میں اپنی طرف سے کافی اضافے کر سکتے ہیں تو ایک ناممکن چیز کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

والدین اور اساتذہ کے قریبی رشتے نے عمارتوں کی آسائش کا مسئلہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ والدین کے پروگرام کو منظم صورت دی جا رہی ہے اور بہت سی رکاوٹوں کے باوجود یہ کام زور پکڑ رہا ہے۔ چنانچہ اسکول کے منتظمین اور تعلیمی بورڈوں کو اس مسئلہ کی موجودہ اور آئندہ صورت حال کے متعلق خاص توجہ دلائی جا رہی ہے اور اندریں حالات اسکولوں کی نئی عمارتوں کے متعلق تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

گھر اور اسکول کا باہمی تعاون

اغلباً اسکول سے بہتر کوئی بھی تجربہ گاہ نہیں جہاں پر والدین معاشرے میں اپنے بچوں اور خاندان کے مسائل اور ضروریات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کے تعاون کے طفیل مختلف قسم کے مشاغل میں والدین کی شمولیت اکثر اوقات مطالعہ اور کارکردگی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ معاشرے کی خدمات میں نمایاں اضافہ اور اُن کی اصلاح ہوتا ہے۔ اس طرح اسکول کی جماعت کا معاشرے کی دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک خاص مقصد کے تحت کام کرنا ایک فطری امر بن جاتا ہے۔ ایک ایسا مقصد جو ایک تنہا جماعت کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

والدین اور اساتذہ اپنے گردوپیش کے حالات میں دلچسپی لیتے ہوئے اور اسکول کی مختلف کارگزاریوں پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے جماعتی تنظیم اور کام سے بہت کچھ حاصل کرتے اور سیکھتے ہیں جو ایک بڑی جماعتی تنظیم میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب اسکول کو والدین کی خاص ذہانت، استعداد اور لیڈرانہ صفات کا پتہ چل جاتا ہے تو پھر انہیں معاشرے کے بڑے پروگراموں میں معاون کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حیثیت سے متعین کیا جا سکتا ہے۔

جب والدین اسکول کے اساتذہ اور دیگر افراد کے ساتھ جماعتوں میں کام کرنے کا طریقہ سیکھ لیتے ہیں تو پھر معاشرے کی مختلف خدمات کے سلسلے میں جو خلا محسوس کیا جاتا ہے اُس میں اُن کی دلچسپی اکثر بڑھ جاتی ہے۔ جان ڈیوی (John Dewey) ایک مشہور و معروف ماہرِ تعلیم نے کیا خوب کہا ہے "عقلمند والدین جو کچھ اپنے بچے کے لئے چاہتے ہیں، اُسے تمام معاشرے کو اپنے بچوں کے لئے چاہنا ضروری ہے۔ اکثر اوقات والدین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے بچے کے لئے چاہتے ہیں، خواہ وہ کوئی منتخب فلم ہو یا کوئی تفریحی سیر و سیاحت، وہی دوسرے والدین بھی چاہتے ہیں۔ مزید براں انہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ مواقع اُسی صورت پیدا کیے جا سکتے ہیں جبکہ والدین کا اشتراکِ عمل ہو۔ ان باتوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب والدین ایک مشترکہ نصب العین کو نظر میں رکھتے ہیں تو اُن کی تعداد کو تقویت ملتی ہے اور نصب العین کے حصول میں انہیں تسکین حاصل ہوتی ہے۔ یہی بچوں کے لئے معاشرے کی بہتر خدمات کہی جا سکتی ہیں۔

امریکہ میں والدین معاشرے کی کونسل یا ترتیبی کمیٹی (Co-ordinating Committee) کے زیرِ اثر ہی کوئی عملی قدم اُٹھاتے ہیں۔ یہ کمیٹی یا کونسل اکثر والدین اور استاد دونوں کے حسبِ منشاء پروگرام اور باہمی تعاون سے وجود میں آتی ہے۔ یہ دونوں کی رضامندی سے ترتیب دیا ہوا پروگرام ہی والدین کی دلچسپی کو اُبھارتا ہے اور انہیں معاشرے کے ایک وسیع میدان میں کام کرنے کے طریقے سکھا دیتا ہے۔ الغرض والدین اور اساتذہ کا اشتراکِ عمل معاشرے کی حالت بہتر بنانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

بچوں کا تھیٹر (Theatre) دراصل ہمارے والدین اور اساتذہ کی فلم کمپنی کے زیرِ اثر ہی وجود میں آتا ہے۔ نو سال کا عرصہ ہوا اس کمیٹی نے بچوں کو اچھے فلمی پروگرام دکھانے کی غرض سے مقامی تھیٹر سے رابطہ بڑھایا لیکن انہیں اس مقصد میں نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ الغرض یہ تھیٹر اُن کی سعی و کوشش سے ہی وجود میں آیا ہے۔ اب تھیٹر کا کام ایک کونسل کے ذمے ہے جس میں 12 مقامی اسکولوں کے نمائندے شامل ہیں۔

پہلے سال تو چند تجارتی فلمیں دکھائی گئیں ___ اب ایک سال میں کوئی 12 ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بچے فلمی تفریح کو کسی اور تفریح سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چنانچہ ہم بچوں کو ایسی تفریح سے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچا سکتے ہیں۔

اب جبکہ والدین کی تعلیمی جماعتوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس میدان میں اپنی دلچسپی کے لحاظ سے اتفاق رائے رکھتی ہیں۔ اُن کا یہ فکر بالکل منطقی قسم کا ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے مسائل کا بغور جائزہ لیں، اُن کا تجزیہ کریں اور اُن کا حل سوچیں۔ خصوصاً ایسے مسائل جو گھر سے اندر اور گھر سے باہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔

بچوں کے مسائل حل کرنے کی غرض سے والدین کی تعلیمی ضلع کونسل وجود میں لائی گئی ہے۔ پانچ ضلع کونسلیں جو تمام شہر کے مدارس سے ترتیب دی جاتی ہیں۔ ایک نمائندہ اور ایک متبادل نمائندہ مرکزی ایڈوائزری کونسل کو بھیجتی ہیں، جو مختلف ماہرینِ تعلیم اور معاشرے کے دیگر معزز افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔

کونسلوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے میں بچوں کی اُن ضروریات کا پتہ چلائیں جن کو پورا نہیں کیا جاتا اور جن کے باعث بچوں کے کردار اور شخصیت میں غیر معمولی پن آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا کام والدین کو معاشرے کی طرف راغب کرنا اور مختلف کارکنوں کے ساتھ کام کرنے پر اُکسانا ہے، تاکہ صحت، سیر و تفریح، تعلیم اور شہری بہتری و بہبودی کے پروگراموں کو احسن طور پر ترتیب دیا جا سکے۔

معاشرہ عام طور پر گھر اور اسکول کے باہمی تعاون کی موجودگی یا غیر موجودگی کو بہت محسوس کرتا ہے۔ دراصل والدین کی کارکردگیاں ہر عمر کے بچوں کے مسائل پر مرکوز ہوتی ہیں۔ گھر اور اسکول کا مشترکہ پروگرام جو گھر اور اسکول کی مشترکہ ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے والدین اور اساتذہ اور معاشرے کے مختلف کارکنوں کو باہم سعی کرنے پر اُکساتا ہے۔ معاشرے کی زندگی پر کوئی تعمیری یا ٹھوس اثر کرنے اور بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے اچھے مواقع بہم پہنچانے کے بغیر کبھی نہیں رہ سکتا۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عنفوانِ شباب کے جھمیلے

پروفیسر سعید شیخ

عنفوانِ شباب کا آغاز نو بالغوں میں جسمانی قسم کے جنسی تغیرات سے ہوتا ہے اور اس عمر کے جھمیلے اولاً جنس سے متعلق ناقص معلومات یا جنس کی طرف غیر صحت مندانہ رویے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ناقص معلومات کی نسبت صحت مندانہ رویہ اس معاملے میں زیادہ اہم ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کہ دونوں میں یک گونہ گہرا تعلق بھی ہے۔ بہرکیف ناقص معلومات ایک عارضی شے ہیں اور ان کی تلافی کسی وقت بھی ہو سکتی ہے، لیکن رویہ تربیتِ نفسی کا ایک مستقل جزو ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح اور صحیح پرورش کے لئے وقت اور محنت درکار ہیں۔ یہ بات بھی یہاں جان لینا ضروری ہے کہ جنس کے بارے میں نو بالغ کے رویے کی تشکیل و تربیت نو بلوغت سے شروع نہیں ہوتی بلکہ کافی حد تک بچپن سے ہی ہو چکی ہوتی ہے اور بچہ، جہاں تک اس کے جذبات کی تربیت کا تعلق ہے، کچھ باتیں تو شعوری طور پر اپنے بڑوں سے سیکھتا ہے لیکن بہت سی باتیں نیم شعوری طور پر اپنے ماحول کی فضا سے جذب کرتا ہے۔ چنانچہ نو بالغ کا جنس سے متعلق جذباتی رویہ وہی ہوتا ہے جو ایک سوسائٹی میں ایک خاص ثقافت جنسی کے تحت پہلے سے ہی بالغوں میں مروج ہو۔ اگر اب ہم اس رویے کا تجزیہ کریں تو اس میں کم از کم تین چیزیں ملیں گی:

1- شدید قسم کا اخفا ـــــ جنس کے بارے میں ماں باپ، اساتذہ اور دیگر بالغوں کا رویہ یہ ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک بہت ہی صیغۂ راز یا پردہ داری کی بات ہے اور اسی لئے اسے بچوں سے بالکل پوشیدہ رکھا جانا چاہئے۔ جنس کے بارے میں عام گفتگو کرنے میں کچھ عریانی کا احساس سا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر جنس کے بارے میں بچہ کوئی معصومانہ سوال بھی کر دے تو عموماً والدین

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو ایک بوکھلاہٹ اور ندامت سی ہوتی ہے اور جواب ڈانٹ، جھوٹ یا گریز ہوتا ہے۔

2- نجس اور گندگی کا احساس ـــــ جنس کو نجس اور ناپاک چیز سمجھا جاتا ہے جیسے بول و براز کو۔ اس لحاظ سے بھی کہ عضویاتی طور پر دونوں میں ایک گہری مناسبت ہے۔ چنانچہ جنس کا ذکر غیر شائستہ لوگ کئی طرح کی برجستہ گالیوں میں کریں تو کریں، ورنہ مہذب اور ثقہ لوگ اس کا نام تک لینا معیوب و مکروہ سمجھتے ہیں۔

3- شدید احساسِ گناہ ـــــ جنس کے ساتھ ایک ایسا شدید احساسِ گناہ لپٹا ہوتا ہے جو کسی اور جذبے یا فعل کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی اور شاید تنہا وجہ یہ ہے کہ جنسی فعل سے نہایت ایسے دور اثر نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کے بہت گہرے معاشرتی اور اخلاقی تضمینات ہوتے ہیں۔ اس لئے سارا معاشرہ جنس کے معاملے میں ایک ہوشیار نگران اور رقیب بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بعض معاشروں میں جنس اور اخلاق کو مترادف سمجھا جاتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ اپنے فطرتی تجسس کی بنا پر قریب قریب سب بچے اپنے جنسی اعضاء کو چھیڑتے بلکہ ہم جنس یا غیر جنس کے دوسرے بچوں سے جنسی قسم کے خفیہ کھیل کھیلتے ہیں۔ اس قسم کی کوئی بات بھی والدین کے نوٹس میں آ جائے تو انہیں اتنی ڈانٹ ڈپٹ اور سزا ملتی ہے کہ جھوٹ بولنے یا چوری کرنے پر بھی نہیں ملتی۔ چنانچہ اس قسم کے کسی ایک ہی حادثے سے جنس سے متعلق گناہ کے ایسے شدید احساسات و خیالات ذہن پر مُرتسم ہو جاتے ہیں کہ زندگی بھر کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بچے میں جنس کے بارے میں وہی رویہ پرورش پاتا ہے جو اس کے والدین یا دوسرے بڑے لوگوں کا ہوتا ہے لیکن بچہ اگر ذہین ہے تو جنس کے بارے میں اس کا تجسس قائم رہتا ہے اور وہ غلط سلط اپنی معلومات اور تجربات میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے۔ نو بلوغت میں جنسی تغیرات کی بنا پر جب جنسی ہیجان بیدار سا ہو جاتا ہے تو جنسی آ گاہی کی ضرورت اور خواہش اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ نو بالغ کو اپنے بچپن کے تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اور موضوعات پر والدین سے کھلم کھلا بات چیت ہو سکتی ہے جنس کے موضوع پر اشارۃً بھی نہیں ہو سکتی۔ جنسی ہیجان کی بنا پر اب اس کو خود بھی اس قسم کی بات کرتے ہوئے بوکھلاہٹ اور پریشانی سی ہوتی ہے لیکن جنسی معلومات کہیں سے تو اسے حاصل کرنا ہی ہیں۔ چنانچہ وہ خفیہ طور پر اپنے ہم خام کار عمروں یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گنوار نوکروں سے اس بارے میں تبادلہ خیالات کرتا ہے، یا کسی اور ناشائستہ ناقص ذرائع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایسی کتابوں کا چوری چھپے مطالعہ کرتا ہے جو تعلیمات جنسی سے زیادہ ترغیباتِ جنسی کے لیے لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جنس کے بارے میں اس کے ذہن میں کئی قسم کے مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں اور جنسی تجسس اور ہیجان اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ جنسی قسم کے تخیلات اور واہمات میں الجھا رہتا ہے۔ جس سے ایک دبا دبا احساسِ گناہ اسے ستاتا رہتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے متعلق خود شکوک وشبہات میں گرفتار ہو جاتا ہے نفسیاتی عمل بروز (Projection) سے والدین، اساتذہ اور دیگر بالغوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اور دوسروں کے درمیان نفسیاتی فاصلے پیدا کر لیتا ہے۔ تنہا پسند ہو جاتا ہے اور تنہا ہی اپنے جنسی مسائل سے الجھتا رہتا ہے۔ چنانچہ بوکھلاہٹ، حجاب، شرمیلا پن، جھینپنا، بے یقینی، افسردگی، دروں بینی وغیرہ وغیرہ، عنفوانِ شباب کے تکلیف دہ خواص، کافی حد تک جنسی کش مکش اور الجھن کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔

نوبالغوں کے جنسی تغیرات کے مظاہر میں سے لڑکوں میں بالخصوص جنسی خواب اور لڑکیوں میں ماہواری کا اجراء ہے۔ لڑکوں کو عموماً یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی گناہ کی دلدل میں پھنس گئے ہیں یا ان کی صحت بُری طرح سے خطرے میں پڑ گئی ہے اور لڑکیاں تو اکثر واقعی بیمار ہو جاتی ہیں۔ اگر ماہواری میں کسی قسم کی بے قاعدگی ہو جائے تو وہ دردناک شبہات کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کہیں حضرت مریم علیہا السلام کے قصے کا اعادہ نہ ہو جائے۔ دونوں جنس کے نوبالغ بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے مقابل میں ان کی جنسی نشوونما خلافِ معمول ہے اور ضرور اس میں کوئی خرابی کی بات ہے۔ اس ضمن میں وہ تجارتی قسم کے حکیموں اور عطائیوں کے اشتہارات بغور پڑھتے رہتے ہیں جن میں مکمل نفسیاتی چالاکی سے جنسی بیماریوں کے سلسلے میں اعصابی کمزوری، نسیان، عدم اشتہاء، طبیعت کی سُستی، سر میں درد، نبض کا تیز یا آہستہ چلنا اور دل کی دھڑکن وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک معمولی ماہرِ نفسیات بھی یہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ یہ علامات کسی جنسی بیماری کی تو کیا محض اس جذباتی انتشار اور تشویش کا نتیجہ ہوتی ہیں جو عنفوانِ شباب کے عام خواص میں سے ہیں۔ لیکن نوبالغ ان عطائیوں کے فریب میں آجاتے ہیں اور اُن کے اپنے متعلق شکوک وشبہات اور توہمات اور راسخ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر ان میں سے اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کی تجویز کردہ دوائیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

استعمال کریں۔نوبالغ نہ جانے کن مصیبتوں سے ان عطائیوں کی جیبیں بھرنے کے لئے پیسے فراہم کرتے اوران کی مختلف قسم کی دواؤں سے اپنی صحت کو واقعی خراب کر لیتے ہیں۔

مندرجہ بالاصورتِ حالات کے پیشِ نظر نو بالغوں کی صحیح جنسی تعلیم و تربیت ایک نہایت اہم اور قابلِ غور مسئلہ ہے۔ بالخصوص جب کہ آج کل کے ماحول میں کئی قسم کے جنسی ہیجانات سرگرمِ عمل ہیں۔اس تعلیم و تربیت کی ذمہ داری مجموعی طور پر جداگانہ حیثیت سے بھی والدین، اساتذہ، ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات پر عائد ہوتی ہے جس سے مزید غفلت یقیناً ایک مجرمانہ بیدردی اور معاشرتی گناہ ہے۔ بچپن سے لے کر نو بلوغت تک بلکہ اس کے بعد بھی جنسی تعلیم و تربیت کا نفسیاتی طریقِ کار کیا ہونا چاہئے۔اس کے لئے ایک الگ مستقل مضمون درکار ہے۔ یہاں ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ بچوں اور نو بالغوں کو ایسے پختہ ذہن معلّم و مربّی کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑی ہمدردی اور متانت سے فرداً فرداً اُن کے جنسی مسائل کو سنیں اور انہیں صحیح مشورہ اور ہدایت دیں۔ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اپنے اور نو بالغ کے درمیان اس نفسیاتی دیوار اور جذباتی مزاحمت کو حائل نہ ہونے دیں جو قدیم جنسی ثقافت کے تحت جنسی موضوعات پر گفتگو کرنے میں اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔سوال کرنے والے کو اجازت ہو کہ وہ بغیر ہچکچاہٹ اور تذبذب کے نہایت بے تکلفی سے اپنے نجی شکوک و شبہات کو پیش کر سکے اور جواب دینے والے میں بھی کسی قسم کی بوکھلاہٹ اور غلط شرم و حیا کے جذبات کی جھلک نظر نہ آئے۔ یہ بھی خیال رہے کہ جوابات لعن طعن یا پند و وعظ کی بجائے سائنسی حقائق آسان فہم، علمی وضاحت اور برجستگی پر مبنی ہوں۔

بہر کیف جنسی جذبے اور خواہش کو نو بالغوں کی شخصیت کی نشوونما اور ارتقاء میں ایک مرکزی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے نزدیک شخصیت کی تشکیل میں جنسی جذبہ کی کارفرمائی تین مختلف ادوار میں ظاہر ہوتی ہے:

1- خود پرستی یا اپنے آپ سے محبت۔

2- ہم جنسوں سے محبت۔

3- مقابل جنس کے افراد سے محبت۔

نو بالغوں کے شخصی ارتقاء کو ادوار کی اس تقسیم سے سمجھنے میں یقیناً بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ ادوار شخصی ارتقاء کی ایسی کڑیاں نہیں جو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بند ہوں۔ یہ ممکن ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ ایک دور میں دوسرے دور کے مظاہر کی بھی خفیف جھلکیاں نظر آئیں اور ضروری ہے کہ ایک دور عبور ہو جانے کے بعد اُس کے تاثرات دوسرے دور میں قائم رہیں اور پوری طرح سے اثر انداز ہوں۔ مانا کہ جنسی جذبہ نوبالغوں میں بالخصوص ایک مرکزی اور اساسی جذبہ ہے تاہم یہ دوسرے جذبات و محرکات سے پورے طور پر الگ تھلگ چیز نہیں بلکہ ان میں بُری طرح سے اُلجھا اور گتھا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ انسانی شخصیت کی نشوونما ایک مسلسل اور نہایت پیچیدہ عمل ہے ان اضافوں کے بعد ہم ماہرینِ نفسیات کی محولہ بالا تقسیم سے پورا استفادہ کرنے میں قطعاً کوئی عار نہیں سمجھتے، بلکہ اسے قبول کرنے سے نوبلوغت کے مختلف حقائق کو ایک ترتیب سے پیش کرنے میں بڑی سہولت پاتے ہیں۔

1- خود پرستی یا اپنے آپ سے محبت

خود پرستی بچوں میں بھی ہوتی ہے لیکن نوبالغوں کی خود پرستی زیادہ واضح اور شدید ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہوتے ہیں: جسمانی اور نفسیاتی۔ جسمانی طور پر نوبالغوں کی خود پرستی کا مظاہرہ کئی طرح کی دلچسپیوں اور کوششوں سے ہوتا ہے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے حسین دکھائی دینا، لباس کی وضع قطع کا فیشن ایبل اور جاذبِ توجہ ہونا، لب ولہجہ اور گفتار و رفتار کا دلکش و بارُعب ہونا، جسمانی بالیدگی میں موزونیت اور اور جنسی کشش ہونا، جسمانی صحت و توانائی کا سالم و مکمل ہونا وغیرہ وغیرہ۔ نوبالغ اپنے تئیں حسین تصور کرتا ہے یا کیسا بھی ہو، حسین بننے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ آئینے میں کافی دلچسپی ہو جاتی ہے گویا وہ ایک رفیق ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ دن میں کئی مرتبہ اپنے حسن کی داد لیتا ہے اور اپنی ستائش میں مصروف رہتا ہے۔ بالخصوص بالوں کی مناسب تراش اور بناؤ سنوار مرکز توجہ بن جاتے ہیں۔ لڑکیاں بال بنانے کے مختلف انداز سیکھتی ہیں اور ان کو چمکیلے، لمبے اور خمدار بنانے کی مختلف تدابیر کرتی ہیں۔ لڑکے حجام کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرتے ہیں اور بال بنواتے وقت انہیں خاص ہدایات دیتے ہیں۔ جیب میں کنگھی سے مسلح رہتے ہیں، کہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ چہرے کی رنگت اگر بدقسمتی سے سانولی ہو یا چہرے پر تل یا کیل ہوں یا کوئی اور جلدی نقص تو دنیا بھر کی ابٹنے، کریمیں اور دوائیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ لڑکیاں بالخصوص چہرے کی ہر تفصیل، ہر زاویے اور نقطے کو حسن کے معیار سے جانچتی اور درست

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتی ہیں۔ بھوؤں کے خط، پلکوں کی لمبائی، کاجل کی لکیر، پیشانی یا کنپٹیوں پر بالوں کی ترتیب، ہونٹوں کی سُرخی وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ حسین بننے کی کوشش میں میک اپ کے فن میں پوری مہارت حاصل کی جاتی ہے۔ پیشِ نظر ماڈل بالعموم کسی فلم اسٹار یا حسینہ کا ہوتا ہے۔ اسی طرح لباس کی وضع قطع اور فیشن ایبل ہونے میں نئی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لڑکا باپ یا بڑے بھائی کی طرح خوش پوشی کے تقاضے کرتا ہے اور اپنے آپ کو اچھے سوٹ، موزوں نکٹائی، رنگین عینک، کلائی پر گھڑی، جیب میں چمکتے ہوئے پین سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ جوتوں کو پالش سے چمکانے کے فن میں سوجھ بوجھ پیدا کی جاتی ہے۔

لڑکیاں لباس کے معاملے میں لڑکوں سے دو قدم آگے ہی ہوتی ہیں۔ ہار سنگھار اور زیورات کی فرمائش بھی ہوتی ہے۔ مناسب ٹو اور ایڑی والی جوتیوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ان سب باتوں میں ماں یا بڑی بہن سے حاسدانہ مقابلہ رہتا ہے، لیکن پھر بھی لباس کی وضع قطع اور دوسری چیزوں میں فیشن کے انداز کا فیصلہ ان پیمانوں سے ہوتا ہے جو اپنے ہم عمروں کے گروہ میں رائج ہوں۔ اکثر وہ اپنے گروہ کے بدلتے ہوئے مقبول انداز کے مطابق اپنے سابقہ لباس میں قطع و برید کر کے خود ہی ترمیم و اصلاح کر لیتی ہیں۔ (Feddyism) کی وبا میں بڑی حد تک یہی ہم عمروں کے گروہ کا نفسیاتی دباؤ کارفرما ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ضرورت سے زیادہ چُست لباس بالخصوص لڑکیوں میں جذبہ خود پرستی یا خود نمائی کی تسکین کے لئے ہے۔ اس میں یہی خواہش پوشیدہ ہے کہ اپنے بڑھتے ہوئے جسم کے مختلف زاویے اور قوسین دوسروں پر نمایاں کیے جائیں۔

ہمیں لباس کی اس چستی اور اس کی نمائشِ جسم اور بے حجابی پر اعتراض ہے تو صرف اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عورت کے حُسن و عظمت کا راز دراصل اس کی حیا اور پردہ داری میں ہے اور یہ بھی کہ مردوں کی جنسی خواہش کی تصعید و ترفیع (Sublimation) کا دارومدار بہت حد تک عورتوں کے باحجاب و باحیا ہونے پر ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کسی معاشرہ کو بلندی و برتری حاصل ہوئی تو عورتوں کے باطنی حسن کی وجہ سے، نہ کہ اُن کے ظاہری حُسن کی نمائش یا جنسی دلکشی کی بنا پر۔

بہر کیف یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ نوبالغوں کو اپنے جسم کی بالیدگی اور بڑھتے ہوئے سڈول پن میں گہری دلچسپی ہوتی ہے، اور وہ چپکے چپکے اپنے جسم کی موزونیت اور حسن کی ستائش کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ خود ستائشی نرگسیت (Narcissism) کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ اس صورت میں نوبالغ اپنے سارے جسم کو آدم قد آئینے میں دیکھنے میں خاص حظ حاصل کرتا ہے۔ اس طرح سے گویا وہ اپنی ہی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ وہ جنسی خفیہ عادت کا بھی شکار ہو جائے اگر ایسا ہو تو یہ جسمانی خود پرستی کی انتہائی صورت ہے۔ جو نوبالغ کو ایک بہت دردناک نفسی کش مکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایک طرف خفیہ عادت سے اس کے جنسی ہیجان کو ایک وقتی آسودگی حاصل ہوتی ہے، دوسری طرف اس سے ذہن میں شدید قسم کا احساسِ گناہ اور اس سے پیدا شدہ گہری تشویش ہو جاتی ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نوبالغ اپنے تئیں اس عادت کا تنہا اور منفرد مرتکب سمجھتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ خفیہ عادت نوبلوغت کی ایک ایسی عام جنسی کجروی ہے جس میں وقتی طور پر کم وبیش سب لوگ بھٹک جاتے ہیں۔

نوبلوغت میں اپنے جسم پر زعم اور ناز ہونا ایک عام چیز ہے۔ لڑکے اکثر اترا کر سینہ پُھلا کر چلتے ہیں اور لڑکیاں اپنی چال میں لچک اور نسائیت پیدا کرتی ہیں۔ لڑکے اپنی بدلتی ہوئی مردانہ آواز میں یک گونہ فخر محسوس کرتے ہیں اور لڑکیوں کو اپنی آواز کی لوچ، شیرینی اور ترنم کو نیم شعوری طور پر دوسروں پر شوخ فقرے چست کرنا بڑا مزہ دیتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جسمانی نشوونما، خواہ معتدل رفتار سے ہی کیوں نہ ہو رہی ہو، نوبالغ اپنی بالیدگی کا ہر دم بڑی بے چینی سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں یہ چاہتے ہیں کہ وہ جلد ہی جوان مرد یا عورت بن جائیں۔ لڑکیاں اپنی چھاتیوں کی نمو کی سُست رفتاری کے بارے میں شاکی سی رہتی ہیں اور لڑکے ہر صبح کو اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ ان کی مونچھیں داڑھی نکل آئیں تاکہ وہ بڑوں کی طرح اپنے سامنے شیو کا سامان سجا سکیں۔ اگر واقعی جسمانی نشوونما رُکی سی ہو تو بڑی تشویش وہ ہوتی ہے۔ لڑکوں کو بالخصوص قد لمبا کرنے کا خبط سا ہو جاتا ہے اور وہ تماشا کرنے والے چینیوں کی طرح جسم کو کھینچنے اور پیچ وخم دینے والی سب کسرتی تدبیریں کرتے ہیں کہ ان کا قد چھ انچ نہ سہی چار انچ اور لمبا ہو جائے۔ اس سلسلے میں دنیا میں قد بڑھانے والے مختلف اداروں سے خط وکتابت کی جاتی ہے یا کم از کم خط وکتابت کے خیالی منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ ان کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی ہمدرد ڈاکٹر انہیں کوئی ایسی جادو اثر دوائی کی گولیاں بتلا دے جس سے ان کا قد ہفتے عشرے میں ہی اپنے گروہ کے ہم عمر ساتھیوں کے برابر ہو جائے، اور کچھ نہ ہو تو وہ خود ہی وٹامنز کی ابجد اور دیگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقوی ادویات وغیرہ کی آزمائش کرتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی نوبالغوں کو اپنی عام صحت کی اصلاح وترقی کا خیال ہردم رہتا ہے اور وہ اس بارے میں اپنا موازنہ دوسروں سے کرتے رہتے ہیں۔ تنومند لڑکے تیز دوڑنے، وزن اٹھانے، لمبی یا اونچی چھلانگ لگانے میں فخریہ طور پر ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں۔ جسمانی ورزشوں اور کھیلوں میں شوق پیدا ہو جانا، بالعموم یہ ایک صحت مندانہ میلان ہے اور ایسا کہ بڑوں کو اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے۔ لیکن بعض نوبالغوں کو اس کا خبط سا بھی ہو جاتا ہے وہ سارا وقت اور توجہ Body Build کے میچوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے اپنی تعلیمی وتدریسی اور دوسری ذمہ داریوں سے گریز یا ان کی کماحقہ ادائیگی میں ناکامی کی نفسیاتی تلافی ڈھونڈتے ہیں۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ سکول یا کالج میں کھیلوں میں تمغے اور انعامات حاصل کرنے والے کئی نوبالغ امتحانوں میں فیل ہوتے رہتے ہیں۔ یا اپنی تدریسی تحصیلات میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر نوبالغوں کی خود پرستی کا مظاہرہ اپنی انفرادیت واہمیت کے احساس، خودداری و خود بینی، شہرت ونا موری کی خواہش، اپنے متعلق اُمنگ بھرے جاگتے خواب، اپنی اَنا سے متعلق کمال بینی وعینیت پسندی (ego-idealization) وغیرہ وغیرہ کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ نوبلوغت میں اپنی ذات کا شعور اس قدر اُبھرآتا ہے کہ نوبالغ اپنے تئیں دوسروں سے بالکل منفرد ہستی تصور کرتا ہے۔ گھر، سکول یا محلے میں وہ اپنا ایک علیحدہ مقام پیدا کرنا چاہتا ہے اور حتی الوسع اپنی اہمیت دوسروں پر جتلاتا رہتا ہے۔ بڑوں کے اقتدار کو اب وہ آسانی سے قبول نہیں کرتا اور اپنے متعلق دوسروں کی رائے بالخصوص تنقید کے بارے میں بہت حساس ہو جاتا ہے۔ اپنے ہم عمروں کے حلقے میں وہ ہر قیمت پر مقبولیت اور ہردلعزیزی کا خواہاں ہوتا ہے۔ کھیل کی ٹیم کا کیپٹن، سکول کی انجمن کا سیکرٹری یا کوئی اور عہدے دار، دوستوں کی بزم میں گرمیء محفل، محلے کے گروہ کا قابلِ توجہ اور معتبر فرد بننے کی آرزو زوروں پر ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ قابلِ فخر بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اخبار میں اس کا نام آجائے یا سکول یا کالج کے میگزین میں اس کی فوٹو چھپ جائے۔ اپنا نام وہ اب پہلے کی طرح سے نہیں لکھتا بلکہ کسی امتیازی اضافے کے ساتھ یا کسی بارعب انداز میں لکھتا ہے۔ دستخط کرنے کے نئے نئے پیراؤں کی مشق ہوتی ہے۔ تحریر وتقریر میں صیغہء واحد متکلم کا ذکر بار بار آتا ہے۔ لڑکی اگر دلکش اور جاذبِ توجہ شکل وصورت کی ہو تو اپنے تئیں حُسن کی ملکہ تصور کرتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے اور لڑکا کسی مشغلے میں خاص صلاحیت کا اظہار کرے یا سکول و کالج کے تدریسی حاصلات میں امتیاز حاصل کرے تو اپنے آپ کو غیر معمولی ذہانت اور خوبیوں کا مالک سمجھتا ہے۔ ہر نوبالغ آئندہ زندگی میں شہرت و ناموری حاصل کرنے کے لئے بہت بلند منصوبے باندھتا اور سنہرے سپنے دیکھتا ہے۔ اپنی اَنا سے متعلق کمال بینی اور عینیت پسندی (ego-idealization) نوبلوغت کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔ اس لحاظ سے یہ مشاہیر پرستی کا دور بھی ہوتا ہے۔ اپنے ماحول کے جذباتی اور قدری پیمانوں کے زیر اثر اور اپنی نفسی تربیت اور ذہنی ارتقاء کے مطابق نوبالغ اپنے مستقبل سے متعلق مختلف قسم کے جاگتے کے خواب دیکھتا ہے۔ اپنا مرقع کمال اسے مختلف ادوار میں مختلف مشاہیر اشخاص میں نظر آتا ہے۔ شروع شروع میں اس سلسلے میں اس کا جاذبِ توجہ یا تو کوئی بڑا کھلاڑی ہوتا ہے یا کوئی فلم سٹار یا ماموں یا چچا جو والد سے کہیں زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہا ہو، یا شاید اسکول کا استاد۔ لیکن مطالعے سے جب اس کا دائرۂ فکر وسیع ہوتا ہے تو اُن کی جگہ اُسے اپنا آئیڈیل دنیا کے کسی بڑے لیڈر، سیاست دان، خطیب، سائنس دان، مفکر، ادیب یا فنکار میں نظر آتا ہے۔ وہ دنیا کا ایک بڑا انسان بننا چاہتا ہے، اتنا بڑا کہ مرنے کے بعد لوگ اس کے گیت گائیں اور انسانی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ کے لئے لکھا جائے۔ اَنا کی عینیت پسندی کے ان سنہری خوابوں میں اور شہرت و ناموری کی اس گہری آرزومندی میں نوبالغوں کی شخصیت کی تشکیل اور نشوونما کی بڑی تعمیری و تخلیقی قوتیں مضمر ہیں۔ لیکن اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ کمال بینی کے یہ جاگتے خواب اور جاہ طلبی کی خواہش بعض اوقات مریضانہ اور خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ نوبالغ زندگی کے تلخ حقائق سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے خوابوں کی دنیا میں ہی کھویا رہے اور واقعی طور پر اپنے نصب العین اور مقاصد کو حاصل کرنے کی بجائے اپنی محرومیوں اور کوتاہیوں کی تلافی محض تخیلات کی دنیا میں ہی ڈھونڈتا رہے۔ ممکن ہے کہ شہرت و ناموری حاصل کرنے کی خواہش ایک مرض کی صورت اختیار کر کے اس میں بھلائی اور برائی کی تمیز باقی نہ رہنے دے، اور وہ غلط ماحول کی غلط تربیت کی وجہ سے دنیا کا ایک بڑا ریفارمر بننے کی بجائے ایک بڑا کالا چور بننے کا ہی فیصلہ کرے۔ حاشا وکلا اس ایضاح سے قطعاً یہ مقصود نہیں کہ نوبالغوں کے سرپرستوں اور بہی خواہوں میں کوئی خوف و ہراس پیدا ہو۔ یہ تو محض اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اَنا کی عینیت پسندی، مشاہیر پرستی اور نام و نمود کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خواہش نوبالغوں کی شخصیت کی نشوونما میں ایسی قوتیں ہیں جن کی مناسب کارفرمائی کے لئے والدین، اساتذہ اوراولی الامر حضرات کو پوری نگہداشت اور بیدار مغزی سے کام لینا چاہئے۔ بالخصوص موجودہ دور میں یہ ذمہ داری کچھ زیادہ ہی احتیاط اور نگرانی کی طالب ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا نوبالغ اپنے متعلق مستقبل کے مرقع کمال کی تشکیل ان جذباتی اورقدری پیمانوں کے زیرِ اثر کرتا ہے جو اس کے ماحول میں ہوں۔ اب اگر ہم اپنے معاشرہ میں مروج جذباتی وقدری پیمانوں کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارے جذباتی رویوں اور قدری احساس میں عجیب افراتفری اورتناقض ہے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں تو ہم مذہب، اخلاق اور دیگر اعلیٰ اقدار کا پرچار کرتے ہیں، لیکن ہماری عملی زندگی میں بہت حد تک مغرب سے آئی ہوئی مادہ پرستی، حسیّت پسندی اورلذت پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ حُسن، خیر، سچائی اور مذہبی اقدار کا ذکر محض ذہنی تعیش پسندی کی حد تک رہ گیا ہے۔ واقعی زندگی میں ہم صرف اعلیٰ منصب، دولت، عمدہ خوراک، اچھی پوشش، اچھی رہائش اور دیگر عیش وعشرت کے لوازمات کے متلاشی رہتے ہیں۔ سب والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے بڑے ہو کر ڈاکٹر، انجینئر، یاسی ایس پی آفیسر وغیرہ بن جائیں، تاکہ اچھا عہدہ، معقول تنخواہ، کوٹھی، نوکر چاکر، ریفریجریٹر، اعلیٰ فرنیچر، بڑی کار اور دوسرے تعیش کے سامان حاصل کرسکیں۔ جائیداد بنائیں اور کنبہ پروری کریں۔ بہت کم ہیں جو یہ گہری آرزو رکھتے ہوں کہ ان کے صاحبزادے کوئی بڑے ادیب، شاعر، فنکار، محققِ سائنس، ریاضی دان، فلسفی، مصلح، مفتی دین یا فقیہ وغیرہ بنیں۔ والدین کے اس عام رویے سے صاف پتا چلتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں مروجہ جذباتی وقدری پیمانوں کی نوعیت وحقیقت دراصل کیا ہے۔ نوبالغوں میں بلند جذبات اوراعلیٰ اقدار کے احساس کی پرورش ہمارے معاشرے کا نہایت مشکل لیکن بڑا اہم مسئلہ ہے، اتنا اہم کہ ہماری قومی زندگی کا آئندہ تحفظ صرف اس کا مناسب حل ڈھونڈ لینے پر ہے۔ آپ یہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے کہ یہ مسئلہ تو دراصل صرف سکول وکالج کے اساتذہ کا ہے۔ جذبات واحساسات کی پرورش سکول وکالج کے فلاکت زدہ اساتذہ کا دخل ہے تو سہی۔ لیکن بہت کم، بالخصوص اب جب کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور معاشیات کے قبیل کے مضامین کو تعلیمی نصاب میں زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہورہی ہے۔ جذباتی وقدری پیمانے تو درحقیقت سنیما گھروں، سرود ورقص کی محفلوں، شعروادب کی مجلسوں اورقہوہ خانوں میں بزم آرائی کرنے والے حلقوں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیار ہوتے ہیں۔ ان کی تشکیل و تربیت، طبیعات، کیمسٹری، ریاضیات یا طب کی خشک درسی کتب سے نہیں ہوتی بلکہ ناولوں، افسانوں اور شعر و شاعری کی کتابوں، روزناموں اور دلکش باتصویر ہفت روزہ رسالوں وغیرہ سے۔ جذبات و احساسات کا تغذیہ اور پرورش کرنے والے ان مختلف ذرائع و وسائل کی کڑی نگرانی اور سماج کی اصلاح حکومت کے اوّلیں فرائض میں سے ہے۔ لیکن ہم سب کا فرض بھی ہے کہ فرداً فرداً ہم خود اپنے جذباتی و قدری پیمانوں کو سیدھا کر لیں اور اپنے کردار و گفتار میں توازن و ہم آہنگی پیدا کریں۔

2- ہم جنسوں سے محبت

مقابل جنس کے کسی فرد سے عشق ہو جانے سے پہلے نوبالغوں کو بالعموم اپنے ہی کسی ہم جنس سے والہانہ لگاؤ ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک دور میں غیر جنس کے افراد سے ایک دلچسپ قسم کی کھچاوٹ اور بیزاری سی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات بہن بھائیوں میں بھی بڑی پُرخاش رہتی ہے۔ لڑکے اوائل بلوغت میں لڑکیوں کو نہ صرف جسمانی طور پر کمزور اور بودا سمجھتے ہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی بزدل اور بیوقوف قرار دیتے ہیں، اور لڑکیاں لڑکوں کو اکھڑ، وحشی، بدسلیقہ اور ناشائستہ گردانتی ہیں۔ لڑکا لڑکیوں کے ساتھ ملنا یا کھیلنا پسند نہیں کرتا، کیوں کہ اس کے گروہ میں یہ ایک قسم کا زنخا پن سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کے نسائی غرور و پندار کے منافی ہوتا ہے کہ وہ کسی لڑکے کو منہ لگائیں اور اپنی ہمجولیوں کو مشکوک قسم کی سرگوشی یا تکلیف دہ رائے زنی کا موقعہ دیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ظاہری نفسیاتی بُعد اور حجاب کے باوجود لڑکوں اور لڑکیوں کے لاشعور کے گوشوں میں ایک دوسرے کے لئے کشش اور دلی خواہش (دبی ہوئی) ہو، لیکن جنسی جذبے کے ارتقاء کی ایک خاص منزل تک یہ دبی ہی رہتی ہے۔ جب تک لڑکے صرف لڑکوں سے اور لڑکیاں اپنے ہم جنسوں سے ہی لگاؤ رکھتی ہیں۔ اب یہ لگاؤ اگر ہم جنس کے ایک معتد بہ حلقے یا گروہ کے ساتھ ہو تو دراصل محض جذبہ غول پسندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہماری توجہ اس وقت گہری والہانہ دوستی کی طرف ہے جو ایک یا دو ہم جنسوں سے ہو جاتی ہے۔ یہ عموماً اسکول کے ہم جماعتوں میں یا بورڈنگ ہاؤس کے ہم عمر ساتھیوں میں نظر آتی ہے۔ بظاہر ان دوستیوں میں ایک غیر معمولی جذباتیت تو نظر آتی ہے، اور بس لیکن ماہرینِ نفسیات جنہوں نے ایسی دوستیوں کا نہایت قریب سے اور وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے، جانتے ہیں کہ ان کے پس پردہ ایک گہرا اہم جنسیت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے جس کے دونوں پہلو ہوتے ہیں: جسمانی بھی اور نفسیاتی بھی۔ البتہ جسمانی پہلو اکثر خفی سا رہتا ہے یا صرف اس حد تک تجاوز کرتا ہے جو کسی معاشرے میں قابلِ قبول ہو۔ مثلاً لڑکوں میں بغل گیری اور معانقہ اور لڑکیوں میں باہم گدگدی اور چٹکی لینا، باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا یا ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے جسم کو دبا لینا بظاہر ہم جنسیت کے معصومانہ انداز میں نفسیاتی طور پر دوست کا دلکش خیال پیہم ذہن پر منڈلایا رہتا ہے اور ملاقات کی زبردست خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ملنے پر ایک دوسرے کی خاطر مدارت کی جاتی ہے، اکٹھے بیٹھ کر گپ شپ لڑانے سے کبھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اکٹھے سیر و تفریح کرنے، کھیلنے، مطالعہ یا شاپنگ کرنے کے پروگرام بنتے ہی رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ تحفوں کو زندگی بھر کے لئے دوست کی نشانی سمجھ کر بڑا محفوظ رکھنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ اگر دوست بیمار ہو جائے یا تکلیف میں ہو تو بے حد تیمارداری اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے دوست جدا ہو جائے اور دوسرے شہر میں چلا جائے تو دیر تک اُداسی اور دلگیری کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ باہم خط و کتابت میں والہانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ہجر و وصال اور سوز و گداز کے مضامین کے اشعار بھی ہوتے ہیں، خواہ وہ سستے قسم کے فلمی گیت ہی کیوں نہ ہوں۔ یقیناً ان دوستیوں میں میل ملاپ کا معاشرتی جذبہ بھی ہوتا ہے۔ نوبالغ دوست میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے۔ ایک دوسرے کو اپنے سربستہ راز بتلائے جاتے ہیں۔ دکھ درد کی رام کتھائیں ہوتی ہیں۔ اپنی آئندہ زندگی کے لائحہ عمل کے تیار کردہ منصوبوں پر تبادلہء خیالات رہتا ہے۔ عمر بھر کے لئے وہ عہد و پیمان ہوتے ہیں اور واقعی بعض اوقات یہ دوستیاں مستقل بھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اکثر بدلتے ہوئے حالات کے تحت زندگی کے دھارے جب مختلف رُخ اختیار کر لیتے ہیں اور نئے تجربات کی وجہ سے کوئی دلچسپیاں مشترک نہیں رہتیں تو یہ لڑکپن کی دوستیاں بس بھولے ہوئے خواب بن جاتی ہیں۔

خامکاروں کی ان باہم دوستیوں میں والدین کو اکثر محض تفریحی تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بے شک انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ذرا دور سے ان کی نگہداشت کرتے رہیں، بالخصوص یہ احتیاط رکھیں کہ دوست کا انتخاب کہیں بالکل ہی غلط نہ ہو۔ اس سے زیادہ مداخلت بیجا یا درشت قسم کی مزاحمت نوبالغوں کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جذبات کی تربیت اور نشو و نما میں ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوستیوں کی ایک اپنی قدر و قیمت ہے۔ ایک دوسرے کا ہم راز ہونے اور باہم غمگساری سے ذہن کئی ایک قسم کے بوجھوں اور الجھاؤ سے محفوظ رہتا ہے۔

3۔ مقابل جنس کے افراد سے محبت

محبت کی آخری اور فطری منزل مقابل جنس کے کسی فرد سے عشق ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک جس میں شہوانی ہیجان کا قریب قریب کوئی شعوری احساس نہ ہو، اور دوسری جس میں عشق اور شہوانیت دونوں کا امتزاج ہو۔

بعض بالغوں کو یہ امکان شاید اب عجیب سا معلوم ہو کہ عنفوانِ شباب میں غیر جنس کے افراد سے عشق میں شہوانی خیالات و جذبات کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بالخصوص ایسے نوبالغ جن کی زندگی اب تک جنسی آلودگیوں سے محفوظ رہی ہو اور جن کے ماحول میں غیر جنس کے افراد کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو یہ بات قطعاً تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا جذبہ عشق دراصل جنسی شہوت کا ہی پرتو ہے۔ اگر کوئی ان سے ایسی بات کرے (تو ایسے شخص سے) انہیں گھن اور کراہت سی ہو جاتی ہے۔ اپنے تئیں وہ اس عقیدے کے حامی ہوتے ہیں کہ سچا عشق محض ایک روحانی جذبہ ہے۔ اپنے وارداتِ عشق کی بناء پر انہیں ایک براہِ راست عرفان سا حاصل ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی شخصیت میں ایک بلند و برتر ہوتا ہے، ویسے ہی عشق حسین جذبوں سے معمور ہو جاتا ہے۔ عشق کی اس کیفیت پر فیض کے اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں ؎

ہمارا دل حسین جذبوں سے یوں آباد ہے گویا
شفق زارِ جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں

یہ صرف ایک داخلی کیفیت ہی نہیں ہوتی بلکہ "تمام کائنات ایک حُسن کا سمندر، ایک ہم آہنگی اور روحانی برتری کا نظام نظر آنے لگتا ہے۔" سوزِ دروں سے دل کی آنکھیں گویا وا ہو جاتی ہیں۔ دنیا اب مختلف نظر آنے لگتی ہے اور سب چیزیں جمالی اور روحانی معنویت میں لپٹی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ شعر و ادب میں معانی کے نئے دریچے کھل جاتے ہیں۔ اور نئے روحانی زلزلے تجربات میں گرجنے لگتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں گہری اور پُر خلوص دلچسپیاں اُمنڈ آتی ہیں۔ بالخصوص موسیقی کے سازوں میں ایک عجیب الہامی پیغام سنائی دیتا ہے اور اس کے سوز میں روح پگھل کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عام الوہیت میں گھل مل جاتی ہے اور معراجِ کمال حاصل کرتی ہے ___ عالمِ شباب میں گویا یہ ایک نفسی بہار کا زمانہ ہے جس میں روح کی کلیاں یک دم چٹک جاتی ہیں۔ یہ سب کیوں کر ہوتا ہے نوجوان خود نہیں جانتے۔ لیکن ماہرینِ نفسیات ہمیں بتلاتے ہیں کہ یہ سب بڑی حد تک ان کی اپنی اَنا کے متعلق کمال بینی اور عینیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ نوجوان دراصل اپنی خودی کی گہری آرزومندی میں ڈوب کر ذاتِ مطلق کے حسن و کمال کی جھلک پا لیتے ہیں اور اس کی روشنی میں تخیل کی مدد سے ایک مرقع کمال تیار کرتے ہیں اور پھر عمل بروز (Projection) سے اس کا عکس محبوب کی ذات میں دیکھتے ہیں۔ محبوب کے ظاہری حسن کے واسطے سے اُن کی اپنی تخلیق کردہ تصویر اور بھی حسین اور بھی مکمل، اور بھی پُر اسرار ہو جاتی ہے۔ محبوب تمام اقدار اعلیٰ کا ایک مثالی نمونہ بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں ربوبیت کی شان نظر آنے لگتی ہے، اس طرح سے عاشق واقعیت کی بگڑی ہوئی صورت میں جمال الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کو صوفی مجاز کے پردے میں حقیقت کی پرستش کہتے ہیں۔ یہ واقعی عشق کی ارتقاء کی بلند ترین منزل میں ایک سرمدی محبت ہے۔ جو ایک لحاظ سے خالص مذہبی اور روحانی واردات ہے۔ ممکن نہیں کہ سب نوجوان عشق کی اس معراج تک پہنچیں لیکن ایسے بھی بدبخت بہت کم ہوں گے جو عشق کی روحانی کیفیت سے بالکل ہی ناآشنا ہوں، مقدرت بھر جو نوجوان اپنے نفس کو عشق کی اس روحانی دولت سے مالا مال کر لیتے ہیں، اسی قدر ان کی شخصیت میں بلندی و پاکیزگی آ جاتی ہے۔ عشق اس لحاظ سے کمینہ افعال اور جنسی کجرویوں سے بچنے کی بہترین تدبیر ہے۔ عشق دراصل انسان کو مکمل بنا دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی تعمیری قوت ہے جو ہماری خودی کو استحکام و یقین، ہمارے ارادوں کو بلندی اور ہماری آرزوؤں کو ذوقِ طلب و جستجو بخشتی ہے۔ عاشق اپنی خاطر نہیں بلکہ محبوب کی خاطر اعلیٰ ترین مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ ذہنی تخلیق کے کارنامے عشق سے ہی عمل میں آتے ہیں۔ ہر شاہکار کا مخاطب درپردہ کوئی محبوب ہوتا ہے اور ہر عظیم الشان کام ایک خاموش ہدیہ محبت ہے۔

بہر کیف اس سے انکار نہیں کہ عشق خواہ وہ روحانی عشق ہی کیوں نہ ہو، جنسی جذبہ ہی کی پیداوار ہے۔ اواخر بلوغت میں نیم پختہ نوجوان جب عینیت پسند ہونے کی بجائے واقعیت پسند ہو جاتا ہے اور آسمانوں کی دنیا سے اتر کر زمین کے باسیوں میں رہنا سیکھ لیتا ہے تو مقابل جنس کے افراد سے عشق کے افلاطونی عقیدے کو خیر باد کہتا ہے۔ عشق دراصل ایک گلاب کے پودے کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرح سے ہے جو اپنے پھولوں کی نکہت و حُسن کے باوجود اپنی غذا جڑوں کے ذریعے سے مٹی اور کھاد سے ہی حاصل کرتا ہے۔ انسان اگر ایک طرف دو پایہ جانور ہے تو دوسری طرف ایک دوغلا قسم کی تخلیق بھی ہے۔ ایک طرف اس کے اندر وہ ربوبی شان ہے کہ فرشتے اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اسفل السافلین بھی ہے کہ حیوان و مویشی اس سے بہتر ہیں۔ انسان کا یہ دوغلا پن دراصل بڑی حد تک اس کے جنسی جذبے کی وجہ سے ہی ہے۔ اگر آدمی اپنے جنسی جذبہ و خواہش کو اپنے ضبط و قابو میں رکھ کر تصعید و ترفیع (Sublimation) کرے تو وہ اُسی کے بل بوتے پر روحانی بلندیاں حاصل کر سکتا ہے اور دنیا میں بڑے شاہکار پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر جنسی خواہش اُس پر اس حد تک غالب آ جائے کہ وہ اس کا غلام بن کر رہ جائے تو بالکل آنکھوں کا اندھا اور کانوں کا بہرا ہو جاتا ہے، اور چشمِ زدن میں اپنے بلند مقاصد اور اعلیٰ اقدار کو جنسی ہیجان کے سیلاب میں بہا دیتا ہے۔

آج جبکہ حُسن، سچائی، خیر اور مذہب کی اعلیٰ روحانی اقدار کی لگن اور سرشاری کا عام فقدان ہے اور مغرب کی حسیّت پسندی اور لذت پرستی ہماری ثقافت میں زیادہ سے زیادہ سرایت کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نوبالغوں کی تادیبِ جنسی ایسے نفسیاتی اصولوں پر کی جائے کہ وہ جنسی خواہش کی زیادہ سے زیادہ تصعید و ترفیع کر سکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنسی خواہش ایک فطرتی چیز ہے لیکن انسان کا کمال تسخیرِ فطرت ہی میں ہے۔

O

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کا ماحول اور والدین

اکرم طاہر

وہ جو نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ "آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔" اس کا مصداق بڑوں سے کہیں زیادہ بچہ ہوتا ہے۔ بچہ پیدائش کے وقت، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے، فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اس کے اوّلیں معلّم، ساتھی اور "ماحول" اس کے والدین ہوتے ہیں۔ اس کے حواسِ خمسہ پر جو اوّلین سمعی، بصری اور دوسرے تاثرات، مشاہدات و کیفیات مترتب ہوتے ہیں۔ وہ براہِ راست والدین اور ان کے گھریلو ماحول سے صادر ہوتے ہیں۔ والدہ خصوصی طور پر بچے پر اپنی شخصیت کی چھاپ لگاتی ہے کہ اس کی آغوش بچے کا گہوارۂ اوّل ہوتی ہے۔ اس گھریلو ماحول کا کینوس بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن بچے کی کل کائنات یہی ہوتی ہے۔

بچے کی تعلیم اور تربیت کے متعلق ہمارے یہاں جو نظریات مروج اور مقبول ہیں وہ حد درجہ سطحی اور جاہلانہ ہیں۔ عام طور پر والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ ایک خاص عمر کو پہنچ کر حصولِ تعلیم کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اساتذہ کے سپرد کر کے اپنی ذمے داری سے سُبک دوش ہو جاتے ہیں۔ بعض والدین تو یہاں تک غیر ذمہ داری کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ بچے کو سکول میں داخل کروا کر برملا کہتے پھرتے ہیں کہ "چلو چھٹی ہوئی۔ کمبخت نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔" ان بدنصیبوں کو یہ کون بتائے کہ "تم نے بچے کو ابتدائی تربیت اور تیاری کے بغیر ہی سکول میں دھکیل دیا ہے۔ جس کا آغاز یہ ہے، اس کا انجام کیا ہوگا؟" کتنے ہی ایسے والدین ہوں گے جو اپنے 'نالائق' اور 'ناکام' بچوں کا رونا ہر کس و ناکس کے آگے روتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس کی نالائقی اور ناکامی کا سنگِ بنیاد انہی کا رکھا ہوا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کی تعلیم و تربیت کا جو میکانکی نظریہ ہمارے معاشرے اور گھروں میں رائج ہے، اس نے بیشتر گھرانوں کی بنیادیں کھود ڈالی ہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے مغربی تعلیم و تربیت کی بھونڈی نقالی میں تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن اس کے مضمرات و افادات کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔ چنانچہ موجودہ طریقِ تعلیم اور اندازِ تربیت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اوّل تو امتحانوں میں طلباء اور طالبات کا ''قتلِ عام'' ہوتا ہے۔ اور جو خوش قسمت کامیاب ہو جاتے ہیں، ان میں سے بھاری اکثریت نہ زبان پر قادر ہوتی ہے نہ قلم پر۔ کسی نے کہا تھا کہ ہمارے تعلیمی ادارے کلرک سازی کی فیکٹریاں ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ان فیکٹریوں نے ڈھنگ کے کلرک بھی تو پیدا نہیں کیے۔

رسول کریم کا قولِ سدید ہے کہ ''گہوارے سے لے کر لحد تک علم حاصل کرو۔'' گویا تعلیم و تربیت کی ابتداء پہلی جماعت اور انتہاء سولہویں جماعت نہیں ہے جیسا کہ ہم سمجھے بیٹھے ہیں۔ بلکہ بچے کے تولد ہوتے ہی اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس کے والدین پر عائد ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت کم والدین اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام خود کرتے ہیں۔

بچے کی تعلیم و تربیت کی شروعات میں نہ انفرادی نفسیات کے عمیق مطالعے کی ضرورت ہے نہ ''بچوں کی نفسیات'' سے آگاہی کی۔ ہاں تعلیم یافتہ والدین کو ان علوم کی الف ب معلوم ہونی چاہئے کہ اس کے بغیر بچے کی منظم تربیت ممکن نہیں ہوتی۔

والدین کو بچے کی تربیت و تہذیب کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ بچے کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے عمل میں ایسا رول ادا کریں کہ اس سے بچے کی شخصیت پامال یا مغلوب ہونے کی بجائے آزادانہ پنپ سکے۔ اس ضمن میں والدین کا رویّہ سختی اور بے جا لاڈ پیار کے بین بین ہونا چاہئے۔ بچے کی دیکھ بھال، تربیت، تہذیب، تادیب اور تعلیم میں درجہ ''اعتدال سے ادھر ادھر نہیں ہونا چاہئے کہ تشدد یا لاڈ پیار دونوں بچے کو بالآخر ''بگڑا بچہ'' بنا دیتے ہیں۔''

بچے سے والدین کا رویّہ متناقص یا متضاد نہیں ہونا چاہئے ___ یوں نہ ہو کہ والد تو بچے کے پیچھے لٹھ لئے پھرتا ہے اور والدہ اس کی پناہ گاہ بنی ہوئی ہے، یا والد تو بچے کو پھوٹی کوڑی دینے کو تیار نہیں اور والدہ چوری چھپے اس کو جیب خرچ دیتی رہتی ہے۔ والدین کو ایک ایسا لائحہ عمل تیار کر لینا چاہئے جو بچے کی صحیح خطوط پر تربیت کر سکتا ہو۔

بچے کی نگرانی ہمہ وقتی توجہ کی محتاج ہوتی ہے، لیکن نگرانی یوں نہیں ہونی چاہئے کہ وہ تلوار بن

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر بچے کے سر پر لٹکتی رہے۔ بس بچے کو یہ احساس رہنا چاہئے کہ والدین مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اس خوف کی بجائے والدین کی جانب سے اک گونہ دلچسپی اور توجہ کا احساس ہونا چاہئے۔ نیز اس کو قدم قدم پر ان کی مہربان رہنمائی حاصل ہونی چاہئے۔

پاکستان کی بیشتر خواتین اَن پڑھ یا نیم تعلیم یافتہ ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہماری معاشرتی پابندیوں نے ان کو گھر کی چار دیواری میں پابند کر رکھا ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ ان خواص سے یکسر عاری ہوتی ہیں، جو بچے کی تربیت کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ دنیا کی عظیم شخصیتوں کی مائیں بھی عظیم ہوتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کو دنیا میں دھکیلنے سے پہلے ان میں وہ تمام خواص اور صفات پیدا کر دیتی ہیں جو آگے چل کر ان کی عظمت کی ضمانت بنتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کی مائیں واقعی بڑی ہوتی ہیں کہ وہ بچے کے اندر اعتماد، اعتقاد، عزت نفس اور بنیادی شرافت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہیں۔

ایسی مائیں اپنی تعلیم یافتہ اور تجربہ کار پڑوسنوں اور ملنے والیوں سے بچے کی تربیت اور تعلیم کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے تعلیم یافتہ شوہروں اور عزیزوں سے مدد لے سکتی ہیں۔ یہ اسی طرح ممکن ہوگا کہ ان کو بچے کی تربیت کا بھرپور احساس ہو۔ اَن پڑھ یا نیم تعلیم یافتہ ماں اپنے بچے کے اندر بیشتر خصوصیات پیدا کرنے کی اہل ہوتی ہے۔ جن کی تخلیق کے لئے رسمی تعلیم ضروری نہیں ہوتی۔ مثلاً صداقت، دیانت اور محبت۔ اسی طرح وہ بچے کی خوراک، لباس اور نشست و برخاست میں اس کی صحیح خدمت کر سکتی ہے تاکہ وہ جسمانی طور پر اچھی طرح پرورش پا سکے۔ غرض یہ ہے کہ اگر محنت اور طریقے سے کام کیا جائے تو بچے کی زندگی کا سنگِ بنیاد اچھی طرح رکھا جا سکتا ہے۔

والدین کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ایک تو بچے کی قوت مشاہدہ بڑی تیز ہوتی ہے اور دوسرے وہ مکمل نقال ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کی گفتگو، حرکات و سکنات، نشست و برخاست وغیرہ سے برابر اثر پذیر ہوتا رہتا ہے اور شعوری، نیم شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے سانچے (Pattern) میں ڈھلتا رہتا ہے۔

انفرادی نفسیات کے ماہروں بالخصوص الفرڈ ایڈلر نے ایسی کئی مثالیں دی ہیں۔ جن سے بچے کے رویئے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ نفسیات کے ان ماہروں کے افکار کا نچوڑ یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ انسان، بالخصوص بچہ اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا اور اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ والدین بچے کو اچھا ماحول مہیا کریں۔

اچھا ماحول کیا ہے؟ اچھا ماحول اعلیٰ فرنیچر، قیمتی کپڑوں اور ٹھاٹھ کی زندگی پر مشتمل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے عناصر اربعہ اچھے انسانی تعلقات، سادہ صاف زندگی، مصروف اوقات اور محبت و مودت ہوتے ہیں۔ آپ اپنے بچے کو یہ عناصرِ اربعہ بہم پہنچا دیجئے پھر دیکھئے وہ کیوں کر ذہنی، جسمانی اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرتا ہے۔

بچہ جب تک منزلِ بلوغ کو نہیں پہنچتا۔ اس کی نشوونما کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ بچے کے لئے پاکیزہ اور پُر محبت ماحول پیدا کریں — ایسا ماحول جو اس کے شریفانہ جذبات کو پروان چڑھائے اور غیر شریفانہ جذبات واحساسات کے سوتوں کو بہنے سے پہلے خشک کر دے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ بچے تمام عمر دوسروں کے محتاج رہتے ہیں

پروفیسر صوفی گلزار احمد

ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ قدیم زمانے میں لوگ ذہنی طور پر پسماندہ افراد کے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ وہ بھوت پریت کے تابع ہیں۔ چنانچہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں۔ انہیں لعنت ملامت کی جاتی، انہیں احمق یا پاگل کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ان کی رہنمائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

ہمارے معاشرے میں ذہنی طور پر پسماندہ بچے کافی تعداد میں موجود ہیں اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ بدنصیب بچے اپنی ذہنی پسماندگی اور نااہلی کے باعث دوسرے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ انہیں قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے بچوں میں قوتِ مشاہدہ مفقود ہوتی ہے، قوتِ استدلال کی کمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی معمولی سے معمولی مسئلہ ہی کیوں نہ ہو، اسے حل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان بدنصیب بچوں کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ گھروں میں والدین ہی انہیں ناپسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے بلکہ مدرسے میں اساتذہ بھی سختی کا رویہ روا رکھتے ہیں۔ انہیں احمق اور پاگل کہہ کر پکارا جاتا ہے، ان کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ ایسے بچے اپنی ذہنی پسماندگی کے باعث مدرسے کے تعلیمی معیار پر پورا نہیں اترتے اور ہزار کوشش کے باوجود مدرسے کے تعلیمی ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اکثر اوقات اساتذہ تعلیم و تدریس کے دوران اپنا صبر و تحمل کھو بیٹھتے ہیں اور انہیں مارتے پیٹتے ہیں۔ اس تشدد کے باعث وہ مدرسے سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان عوامل نے ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کا مسئلہ بہت سنگین بنا دیا ہے جو ہماری فوری توجہ کا مستحق ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنا ذرا مشکل کام ہوتا ہے۔ ان کی دلچسپیاں بہت کم ہوتی ہیں اور ان کی توجہ میں با آسانی رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے۔ یہ کسی کام کی طرف دیر تک توجہ مرکوز نہیں کر سکتے۔ ان کا حافظہ عام طور پر کمزور ہوتا ہے۔ ان بچوں میں قوتِ متخیلہ یا تخلیقی قابلیت بہت کم ہوتی ہے۔ ذہنی طور پر پسماندہ بچے شخصیت کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر بچے اطاعت گزاری اور عجز وانکساری سے کام لیتے ہیں اور دوسروں سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔

ذہنی پسماندگی کے بہت سے اسباب ہیں اور اکثر حالتوں میں دو یا دو سے زیادہ عوامل ذہنی پسماندگی میں حصہ لیتے ہیں۔ تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلا ہے کہ وراثت ذہنی پسماندگی کا بہت بڑا سبب ہے۔ پچاس سے پچھتر فیصد ذہنی طور پر پسماندہ بچے ذہنی طور پر پسماندہ والدین کی اولاد ہوتے ہیں۔ کسی خاندان کے ناسازگار اقتصادی حالات بچوں میں ذہنی پسماندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ناسازگار معاشرتی اور اخلاقی حالات بھی بچوں میں ذہنی پسماندگی پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اگر بچوں کو مناسب غذا میسر نہ آئے اور غذا میں حیاتین کی کمی ہو تو ایسی صورت میں ذہنی پسماندگی جنم لیتی ہے۔ اگر والدین کم عمر کے ہوں تو ان کے بچے بھی ذہنی طور پر پسماندہ پیدا ہوتے ہیں۔ والدین کی مستقل بیماری بھی بچوں میں ذہنی پسماندگی کا سبب بنتی ہے۔ جذباتی عدم توازن بھی ذہنی پسماندگی کا موجب بنتا ہے۔ جو والدین منشیات کا بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں ان کے بچوں میں بھی ذہنی پسماندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیدائش سے پہلے یا بعد میں دماغ کو کسی قسم کی ضرب پہنچنے سے بھی ذہنی پسماندگی وجود میں آتی ہے۔ دماغ میں کسی قسم کی گلٹیاں یا رسولیاں پیدا ہونے سے بھی ذہنی پسماندگی ظہور میں آتی ہے۔ دماغ کے پردوں میں سوزش کے باعث بھی ذہنی پسماندگی کے پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ تھائیرائیڈ غدود میں کسی قسم کی خرابی کے باعث بھی ذہنی پسماندگی جنم لیتی ہے۔ پیدائش سے قبل غیر مکمل بالیدگی کی صورت میں بھی بچے ذہنی طور پر پسماندہ پیدا ہوتے ہیں۔ پیدائش سے قبل حمل کے دوران جسمانی اور ذہنی طور پر پسماندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ دورانِ حمل اگر کسی طرح بچے دانی کو ضرب پہنچ جائے تو اس سے بھی ذہنی پسماندگی وجود میں آتی ہے۔ بعض ذہنی طور پر پسماندہ بچے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ظاہری شکل وصورت سے مشرق کے افراد سے ملتے جلتے ہیں، انہیں منگول بچے کہا جاتا ہے۔ غریب اور ناخواندہ لوگوں کے علاوہ اچھے متمول لوگوں کے بچے بھی منگول ہوتے ہیں۔ منگول قسم کے بچے بڑے ہوشیار اور بیدار قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ ہشاش بشاش

www.iqbalkalmati.blogspot.com: مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ان میں سے دو تہائی فاتر العقل اور دوسرے ایک تہائی احمق ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ تحقیقات سے اس بات کا بھی پتہ چلا ہے کہ بچوں کی یہ قسم اس صورت میں جنم لیتی ہے جبکہ والدین آتشک زدہ ہوں، منشیات کے عادی ہوں، غذا میں حیاتین کی کمی ہو، ماں کی صحت نہایت کمزور ہو۔

بعض ذہنی طور پر پسماندہ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اور بہت کم عمر پاتے ہیں۔ دراصل ان کے دماغ چھوٹے ہوتے ہیں اور کم نشوونما پاتے ہیں۔ ایسے بچے تعداد میں ایک فیصد سے بھی کم ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی حرکات بہت تیز ہوتی ہیں۔ ان میں اکثر فاتر العقل اور احمق ہوتے ہیں۔

معاشرے میں ذہنی پسماندگی کی روک تھام کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے:

1- ذہنی طور پر پسماندہ والدین میں طبی طریقوں سے بانجھ پن پیدا کر دینا چاہئے تا کہ وہ آئندہ ایسے بچے پیدا نہ کر سکیں۔

2- اگر کسی خاندان میں ایسے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہو تو والدین کو اپنا نفسیاتی اور طبی معائنہ کرانا چاہئے۔ اگر پھر بھی ایسے بچے پیدا ہوتے رہیں تو انہیں ضبط ولادت سے کام لینا چاہئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے کی مشکلات اور اُن کا حل

ڈاکٹر مِس اقبال ڈار

کچھ عرصہ ہوا ایک مقامی سکول کی ہیڈ مسٹرس صاحبہ گٹھے ہوئے جسم کے ایک چھوٹے سے لڑکے کو لیڈی میکلیگن کالج، لاہور کے چائلڈ گائیڈنیس کلینک میں لائیں۔ انہوں نے اُس کا تعارف فرسٹ گریڈ کے طالب علم حمید (نام اصلی نہیں) کے نام سے کرایا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، وہ بھی مسکرایا۔ وہ کچھ شرمایا ہوا اور ڈرا ہوا تھا۔ میں اُس کے پاس گئی اور اُس کو کمرے کی چیزیں دیکھنے کے لئے کہا۔ وہ ہچکچایا۔ وہ اپنی ہیڈ مسٹرس سے الگ ہونے سے کچھ خوفزدہ تھا۔ انہوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور کمرے کی چیزیں دیکھنے کو کہا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کمرے کی چیزیں دکھانے لگی۔ وہ شرما کر تصاویر اور کھلونے دیکھنے لگا۔

"حمید! کیا تم ان کھلونوں میں سے کسی کھلونے سے کھیلو گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور چپکے سے اپنی ہیڈ مسٹرس کے پاس جا بیٹھا۔

میں نے اُسے ایک کینڈی دی اور جب اس کی ہچکچاہٹ دور ہو گئی تو میں نے ایک پنسل اور کاغذ اس کے سامنے رکھ کر پوچھا۔ "کیا تم آدمی کی تصویر بنا سکتے ہو؟"

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ "اچھا تو پھر ایک بہت عمدہ سی تصویر بنا دو۔" میں نے کہا۔

اُس نے پنسل پکڑ لی اور آدمی کی تصویر بنانے لگا۔

اس عرصے میں ہیڈ مسٹرس صاحبہ اس کے معاملے کے متعلق یوں گویا ہوئیں:

"حمید کی عمر آٹھ سال ہے اور سکول میں فرسٹ گریڈ میں پڑھتا ہے۔ اُس کی استانی کہتی ہے کہ وہ بے چین رہتا ہے اور سکول کے کام میں کوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دلچسپی نہیں لیتا۔ سارے مضامین میں کمزور ہے اور اپنا بیشتر وقت دوسروں کو تنگ کرنے میں گزارتا ہے۔ جب میں آ جاؤں تو بڑا مسکین بن جاتا ہے لیکن جونہی تنہا ہو لڑنے جھگڑنے پر تل جاتا ہے۔"

"حمید کھیلنے کودنے کو پسند کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ کھیلوں میں پیش پیش رہنا چاہتا ہے۔ وہ دوسروں پر غلبہ چاہتا ہے اور جو اُس کی بات نہ مانے اُن کو پیٹتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے اور اُن میں ہر دل عزیز نہیں ہے۔"

اس پر میں نے ہیڈ مسٹرس سے حمید کے متعلق کئی سوالات پوچھے:

"فرسٹ گریڈ کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اُس کی عمر کتنی ہے؟ اُس کی گھریلو زندگی کے بارے میں آپ کو کتنا علم ہے؟ اگر وہ کسی بات کو سیکھنا چاہتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا آپ نے اس کی عام صحت کے متعلق کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا ہے؟"

چونکہ ہیڈ مسٹرس صاحبہ حمید کے عام رویے کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں اس لئے کلینک کے ایک سوشل ورکر کے ذمے یہ کام لگا دیا گیا کہ وہ اس کے سکول اور گھر سے اُس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرے۔ اُس کے والد سے ملاقات کے بعد اس آدمی نے بچے کی گھریلو زندگی کے متعلق جو رپورٹ دی وہ حسب ذیل ہے:

"حمید کے والد صاحب ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں اور نفسیات سے کچھ واقف ہیں۔ وہ ایک متوسط درجے کے رہائشی رقبے میں رہائش پذیر ہیں اور لڑکے کی بیشتر ضروریات کو پورا کرنے کا مقدور رکھتے ہیں۔ حمید چار لڑکیوں میں واحد لڑکا ہے۔ وہ والدین کا دوسرا بچہ ہے۔ گو اس کا والد اُسے کوئی نامناسب اہمیت نہیں دیتا۔ حمید اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ وہ سارے خاندان میں واحد لڑکا ہے۔ وہ اپنی بہنوں تک سے یہ کہتا ہے کہ میری مناسب عزت کرو اور اُن سب کو پیٹتا ہے۔ عام طور پر سچ بولتا ہے۔ اگر وہ کسی کو پیٹے تو بے تکلف اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سکول کے کام کے متعلق جھوٹ بولتا ہے۔ اُس کا دادا از حد لاڈ پیار کر کے اُسے بگاڑتا ہے اور عام طور پر اُسے تحائف خرید کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حمید نت نئے تقاضے کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والا ننھا مطلق العنان بن رہا ہے۔ جونہی کسی دوست کے پاس یا کسی دوکان پر وہ کوئی نیا کھلونا دیکھتا ہے تو اس کے لینے پر اصرار کرتا ہے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اسے حاصل نہ کر لے۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی چاہتا ہے کہ اُس کے جملہ مطالبات پورے کیے جائیں۔ وہ اس بات کو ہر گز پسند نہیں کرتا کہ اُس کی کسی بات سے انکار کیا جائے یا اُسے پورا کرنے میں دیر کی جائے۔

''حمید کے والد کو شکایت ہے کہ سکول میں بچے پر بہت زیادہ بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لڑکے سے بہت زیادہ مضامین پڑھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو اسے محض اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ اُس نے سوشل ورکر سے سکول کے بھاری نصابِ تعلیم کے متعلق رائے طلب کی۔ ورکر نے سکول کے پروگرام پر رائے زنی کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اُس سے پوری طرح واقف نہ تھا۔''

ورکر نے پھر حمید کی استانی سے ملاقات کی۔ اس نے مندرجہ ذیل رپورٹ کی:

''بچہ بہت لاپرواہ ہے۔ وہ کبھی اپنا گھر کا کام نہیں کرتا۔ وہ ذمہ داری سے گریز کرتا ہے، اُس کے والدین کو اس کے سکول کے کام میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیے۔''

حمید اپنے سکول کے امتحانات میں دو کے سوائے تمام مضامین میں فیل ہو گیا۔ اُس نے دستی کام اور حساب میں قابلیت دکھائی۔ وہ بیرونی کھیلوں سے محظوظ ہوتا رہا لیکن دوسرے بچوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ جب سوشل ورکر نے حمید کی صحت کے ریکارڈ کی نسبت دریافت کیا تو استانی کہنے لگی کہ سکول کے ڈاکٹر نے اُس کا معائنہ کیا تھا اور اسے جسمانی طور پر تندرست پایا تھا۔

سوشل ورکر کی فراہم کردہ معلومات ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں از حد مفید ہیں لیکن یہ مشکلات کے منبع کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کافی نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بچے کس طرح سوچتے ہیں اور اپنے متعلق اور دوسروں کے متعلق کیا محسوس کرتے ہیں ٹیسٹ لیے جائیں۔ ان امتحانات سے ہر بچے کی ان خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مختلف حالات میں اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے اور مدد ملنے سے وہ کس طرح فائدہ حاصل کرتا ہے۔ سائیکومیٹرسٹ (Psychometrist) واحد شخص ہے جو ایسی سائنٹیفک معلومات بہم پہنچا سکتا ہے جو ایک بچے کے مسائل کی موزوں تفتیش کے لئے ضروری ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چونکہ کلینک میں کوئی تربیت یافتہ سائیکومیٹرسٹ (Psychometrist) موجود نہیں ہے اس لئے میں نے حمید کے چند ٹیسٹ لینے کا انتظام کیا، سب سے پہلے اُس کا ''ورلڈ ٹیسٹ'' لیا گیا۔ اس ٹیسٹ میں ایک نیلا بکس شامل ہے جس میں ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی اشیاء موجود ہوتی ہیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ میں نے یہ بکس حمید کے سامنے رکھا اور چھوٹی چھوٹی اشیاء کو اُٹھا کر حمید سے کہا ''دیکھو یہ ایک ہاتھی ہے، اور یہ ایک موٹر ہے۔ وہ ایک مکان ہے اور یہ ایک درخت۔ یہ دیکھو دریا ہے اور مگر مچھ بھی ہے۔''

حمید رنگ برنگے کھلونوں سے مسحور ہو گیا اور انہیں بکس میں سے نکالنے لگا۔ تب میں نے اسے کہا کہ وہ اپنی ایک چھوٹی سی دنیا آراستہ کرے۔ آدھ گھنٹے کے بعد اُس نے اپنی ساری دنیا سجا کر رکھ دی۔ حیوانات کو ایک طرف کھڑا کیا گیا تھا، اور مکانات، سڑکیں اور موٹریں دوسری طرف، اس سے پوچھا گیا ''یہ تم نے کیا بنایا ہے؟'' اس نے جواب دیا ''انسانوں اور حیوانوں میں جنگ ہونے والی ہے۔ وحشی حیوان سڑکوں پر دیوانہ وار دوڑیں گے اور لوگوں کو مار ڈالیں گے۔''

''ورلڈ ٹیسٹ'' ایک سادہ انعکاسی تکنیک ہے جن میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ لوگ چیزیں بنانے کا شوق رکھتے ہیں اور ان کی بنائی ہوئی چیزیں اُن کی شخصیات کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ ٹیسٹ، گو امریکی بچوں کے لئے تیار کیا گیا ہے لیکن آسانی سے ہمارے اپنے بچوں کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ثقافتی تعصب سے تقریباً پاک ہے۔ اشیاء کی ترتیب کے دیکھنے اور حمید کے جواب سے مجھے اُس کا مسئلہ سلجھانے کے لئے بصیرت مل گئی۔

اس کے بعد میں نے اُس کا (Pre-primary California Test of Mental Maturity) لیا، گو یہ بھی ایک امریکی ٹیسٹ ہے، اسے اپنی ضرورت کے مطابق اپنا لیا گیا ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور اس ٹیسٹ کے لئے نئے نمونے بنائے گئے ہیں۔ ان نئے نمونوں کے مطابق حمید کا نتیجہ خراب نکلا۔ اُس کا I.Q goodenough Man Drawing Test میں بھی اُس کی رفتار اوسط سے کم تھی The goodenough Intelligence Scale قابلیت کی پیمائش کا ایک آسان آلہ ہے۔ اس میں بچہ ایک آدمی کی تصویر بناتا ہے جس کو تیزی اور آسانی سے بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ اس مسئلہ پر سوشل ورکر اور ماہر نفسیات کی معلومات کی روشنی میں غور کیا جائے۔ ہم نے مسئلہ کی تفتیش کرنے، ضروری تدبیر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تجویز کرنے اور مؤثر علاج دریافت کرنے کے لئے آپس میں مشورہ کیا۔ مسئلہ کے گہرے مطالعے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ مسئلے کو مزید سمجھنے اور مشکل کے حل کے لئے حمید کو کلینک میں Play Therapy (کھیل کود کے ذریعے علاج) کے لئے ضرور آنا چاہیے۔

Play Therapy میں بچے کو شدت، ناکامی، بغاوت، عدم تحفظ اور پریشانی کے جذبات کے اظہار کا ایک موقعہ دیا جاتا ہے۔ ان جذبات کے اظہار سے وہ اُنہیں عام سطح پر لے آتا ہے، اُن کا مقابلہ کرتا ہے، اُن پر قابو پانا سیکھتا ہے یا اُنہیں ترک کر دیتا ہے۔ کھیل کے سیشن میں وہ ایک فرد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ وہ کھلونوں سے جس طرح چاہے کھیل سکتا ہے اور وہ اس میں مطلق العنان ہوتا ہے۔

حمید کے والد نے کلینک کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اپنے بیٹے کو کھیل کے سیشن میں بھیجنے پر رضامند ہو گیا۔ وہ خود حمید کو پہلے سیشن میں لایا۔ میں نے حمید کو سنبھال لیا اور اُسے کھیل کے کمرے میں لے گئی جہاں اُس نے ایک سپرنگ منتخب کیا۔ اُس نے اُسے کھینچا اور پھر اُسے اس کی اصلی حالت میں آنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اُس نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ پھر اُس نے مٹی سے کھیلنا چاہا، میں نے اُس سے کہا کہ اپنے مطلب کے رنگ کی مٹی چن لے، اور اُس نے مختلف رنگوں کی مٹی کے ٹکڑے منتخب کئے، اُس نے اپنی پوری قوت سے ٹکڑوں کو پیس ڈالا اور مٹی کو بھونڈے گیندوں کی شکل میں ڈھال دیا۔ یکا یک وہ اپنی نشست سے اُٹھا، کمرے میں ایک ننھی سی لڑکی کے پاس پہنچا اور اس کے بنائے ہوئے تمام ننھے منے کھلونے توڑ ڈالے۔

سیشن کے اختتام پر میں نے اُس سے باتیں کیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں نے ایک گیند اپنے والد کے لئے بنائی تھی اور دوسری اپنی والدہ کے لئے۔ اُس نے کہا کہ میں نے لڑکی کے کھلونے اس لئے توڑے ہیں کہ چیزوں کو توڑنا پھوڑنا مجھے پسند ہے۔

کھیل کے دوسرے سیشن میں اُس نے ایک ٹرک چنا اور اُس سے کھیلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے لئے ایک اور ٹرک لایا۔ اُس کے اور میرے ٹرک میں دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے اُس کا ٹرک میرے ٹرک سے آگے نکل گیا۔ پھر اُس کے ٹرک کی میرے ٹرک کے ساتھ ٹکر ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے کئی حادثات ہوئے۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے سپاہی زخمی ہو گئے۔ ایک کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دوسرے کا بازو۔ اُس نے تمام سپاہیوں کو اُٹھایا اور جنگ کا ایک منظر ترتیب دیا جس میں اُن

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں سے کئی مارے گئے۔ معاً اُس نے مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کے پاس پستول ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں'' ___ اُس نے فخریہ اعلان کیا ''میرے ابا کے پاس ہے۔ ایک دفعہ میں نے اُسے سیکھنے کے لئے اُٹھایا اور دو لڑکوں کو نشانہ بنا دیا۔''

جب وہ تیسرے سیشن کے لئے آیا تو مجھے بڑے تپاک سے ملا اور معمّوں سے کھیلنے کی خواہش کی۔ وہ تصاویر کے کئی ٹکڑوں کو فریموں میں لگانے لگا۔ اُس نے اکثر ٹکڑوں کو غلط خانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ وہ بہت جلد معمّوں سے کھیلنے سے اُکتا گیا۔ پھر اُس نے ربڑ کی ایک گیند اٹھائی اور اُسے زور زور سے کیکیں مارنے لگا۔ کلینک کے ایک لڑکے نے حمید سے کہا ''ایسا نہ ہو کہ کھڑکی کے شیشے ٹوٹ جائیں''، حمید پھر بھی ویسا ہی کرتا رہا لیکن بعد میں جلد ہی باز آ گیا۔

کچھ عرصے کے لئے حمید کلینک میں اپنی ساری سرگرمیوں میں بغاوت کا اظہار کرتا رہا۔ اُس نے دوسرے بچوں کو تنگ کیا اور اُن کے کھلونے توڑ پھوڑ دیئے۔ اُس نے فائر کرنے، جان سے مار دینے اور نشانہ لگانے کی باتیں کیں، آئندہ سیشن میں وہ پُرسکون ہو گیا۔ اُس نے بتدریج کھیل کے معالج سے یارانہ گانٹھا اور رنگ دار مٹی، سٹرنگ پینٹنگ، فنگر پینٹنگ اور پتنگ اڑانے میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بڑی ذمہ داری سے گروپ سیشنوں میں دوسرے بچوں کو ایزل، برش، رنگوں کے ڈبے اور کاغذ پکڑانے لگا۔ اُس نے تصویریں صاف کیں، برش دھوئے اور ہر شے کو قرینے سے رکھا۔

کیس کے ایک مکمل مطالعے کے بعد کلینک کا سارا عملہ اس قابل ہو گیا کہ حمید کے معاملے کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد کرے۔ ماہر نفسیات، سوشل ورکر، کھیل کے معالج نے حمید کے والد اور سکول سے مندرجہ ذیل سفارشات کیں:

حمید کا اصل مسئلہ دوہرا ہے۔ وہ گھر پر بہت زیادہ محفوظ ہے اور اُس سے بہت لاڈ پیار کیا جاتا ہے۔ اُس سے کسی ذمہ داری کی توقع نہیں کی جاتی۔ چونکہ گھر میں وہ واحد لڑکا ہے اس لئے ایک مطلق العنان بن گیا ہے اور اپنی بہنوں کو تنگ کرتا ہے۔ اس کے برعکس سکول میں اُس سے بہت کچھ مطالبہ کیا جاتا ہے۔ حمید کی ذہنی قابلیت محدود ہے اور درسی تعلیم کی طرف اُس کا بہت کم میلان ہے، لیکن پھر بھی اُس سے کئی درسی مضامین پڑھنے کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ گھر پر اُس کی بالکل مزاحمت نہیں کی جاتی اور سکول میں حد سے زیادہ بوجھ نے اُسے پریشان کر دیا ہے۔ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صورتِ حال سے نپٹنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے رویے میں باغی ہو گیا ہے۔

استانی کیا کرے؟ استانی کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ حمید کو ایک تعلیمی نمونے میں زبردستی ڈھالنا بے کار ہے۔ اُسے اُس کے بے چین اور پریشان رویے کے لئے سزا نہ دینی چاہئے۔

استانی کو چاہئے کہ حمید کو عملی کام میں دلچسپی لینے پر اُبھارے۔ وہ ایک چُست چالاک لڑکا ہے اور اگر اُسے اپنی عملی لیاقت کے اظہار کا موقعہ دیا جائے تو وہ ایک اچھی کارگزاری دکھائے گا۔

اُس کے والدین کو سمجھ لینا چاہئے کہ آٹھ سال کے تمام لڑکوں کو گھر کی کوئی نہ کوئی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔ حمید چونکہ آٹھ سال کا ہے اس لئے اسے گھر کے کام میں مدد دینی چاہئے۔ اگر وہ گھر پر کام کرنا سیکھ لے تو وہ سکول کے مطالبات پورے کرنے کے قابل بن جائے گا۔ اگر اُس کے موجودہ طور طریقے جاری رہے تو وہ ایک جابر بن سکتا ہے۔ لہٰذا والدین کو چاہئے کہ اپنی بہنوں کے ساتھ کھلونوں اور شفقت میں اُن کا شریک بننے میں اس کی مدد کریں۔

حمید اپنی مشکل میں ایک دن، ایک ہفتے یا ایک سال میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح کلینک کے ماہرینِ خصوصی ایک دن، ایک ہفتے یا ایک سال میں اسے اس کی مشکل سے نجات نہ دلا سکے۔ کچھ عرصے تک اُسے کام کرنے اور اپنی گتھی سلجھانے کے سلسلے میں مدد دی گئی۔ بہرکیف میں محسوس کرتی ہوں کہ حمید کے کلینک میں آنے کے دن سے لے کر آج تک بہت سی باتیں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔

اُس کی استانی کو یقین ہو گیا ہے کہ وہ سکول میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے، وہ اپنے رویے کی ذمہ داری محسوس کرنے لگا ہے اور پڑھنے لکھنے میں تھوڑی سی ترقی کرنے لگا ہے۔ اُس کے والدین محسوس کرنے لگے ہیں کہ وہ گھر پر ایک معاون ثابت ہونے لگا ہے اور اپنی بہنوں سے محبت کرنا سیکھ رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غلط افتادہ بچے

پروفیسر چوہدری عبدالقادر

بوڑھا ہو یا جوان ہر کوئی غلط افتادہ ہو سکتا ہے لیکن بچوں کے لئے غلط راستہ اختیار کر لینا نسبتاً آسان ہے۔ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے ماحول کا صحیح جائزہ لے سکیں۔ ان کی چھوٹی سی زندگی سماج کی مٹھی میں ہوتی ہے، جیسے معاشرہ چاہے ان کی زندگی کو ڈھال سکتا ہے۔ پس بچے کا صحیح یا غلط راستہ اختیار کرنا اس کے بس کا کام نہیں۔ بڑی حد تک اس کی ذمہ دار سوسائٹی ہے، اگر سوسائٹی غلط ہو تو بچے لازماً غلط افتادہ ہوں گے۔

ماحول سے مطابقت ہر ایک کے لئے لازمی ہے جیسے بچہ ماحول سے عدم توافق کی بنا پر اپنے خاندان اور معاشرے کے لئے اذیت کا باعث بن سکتا ہے۔ ویسے ہی معاشرے بھی بے آہنگی کے باعث ارتقاء کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور بسا اوقات ایسے ختم ہوتے ہیں کہ ان کا نام لیوا بھی باقی نہیں رہتا۔

میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کی غلط افتادگی کی ذمہ داری والدین اور استادوں کے کندھوں پر ہے۔ اگر والدین خود ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہوں یا اگر انہیں غربت اور افلاس کی وجہ سے دو وقت کا کھانا نصیب نہ ہو، یا اگر وہ خود لڑتے جھگڑتے رہتے ہوں تو ان حالات میں اگر بچہ ذہنی طور پر پریشان رہے تو اس میں بچے کا کیا قصور ہے۔ جب فطری اور سماجی ماحول ہی ناسازگار ہو تو بچہ غلط افتادہ کیوں نہ ہو۔ ہمارے اکثر لوگ مفلوک الحال اور تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ بچوں کی پرورش کن اصولوں کے تحت ہونی چاہئے اور اگر انہیں اس کا علم بھی ہو تو ان کے پاس وسائل نہیں کہ اپنی اور بچوں کی زندگی ان اصولوں کے مطابق گزار سکیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ ہمارے گھروں میں بچوں کی دیکھ بھال دقیانوسی اور فرسودہ توہمات کے تحت سرانجام پاتی ہے۔ اس سے جو شخصیت بنتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

جیسے والدین کا حال ہے ویسا ہی استاد صاحبان کا ہے، ان کی زندگی بھی انتہائی غربت میں گزرتی ہے۔ تنخواہیں قلیل ہیں اور اخراجات حد سے زیادہ۔ اگر وہ اپنی بیزاری، بچوں کو مارنے پیٹنے سے کم کرتے ہیں تو انہیں مجبور سمجھنا چاہیے۔ وہ ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہیں، انہیں قلبی سکون اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ بچوں کو بے دردی سے پیٹیں۔ یوں تو اگر استادوں سے پوچھا جائے کہ وہ کیوں پیٹتے ہیں تو وہ اس کی وجہ بچے کی اصلاح بتاتے ہیں۔ والدین کا بھی یہی جواب ہوتا ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ایسے دلائل محض دھوکا ہوتے ہیں، اصلی سبب لاشعوری خواہشات اور دبی ہوئی مرضیات ہیں جن کا علم نہ تو استاد صاحبان کو ہوتا ہے اور نہ ہی والدین کو۔

کون نہیں جانتا کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو چند سالوں تک وہ بڑوں کی نگاہ میں انتہائی درجے کا خودغرض خودبین اور خودستا ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ یہ دنیا اسے آرام دینے کے لئے بنی ہے۔ لہٰذا اگر ذرا سی بے آرامی ہو تو وہ شور مچاتا ہے اور اس کا شور اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک بے آرامی کا سبب دور نہ کر دیا جائے۔ اس کی بے بسی اور ضد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام چھوٹوں اور بڑوں کی خواہش ہوتی ہے کہ بچے کو انتہائی آرام پہنچایا جائے۔ اس کوشش میں والدین غلاموں سے بھی زیادہ بچے کی خدمت کرتے ہیں۔ غلام اپنے مالک کی نافرمانی کرسکتا ہے لیکن شاذ ہی کوئی ماں باپ ہوگا جو اپنے بچے کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اس سلوک سے بچے کے دل میں لاشعوری طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کائنات کا حاکم اور فرماں روا ہے اور ہر شے اس کی تسکین اور تشفی کے لئے بنی ہے۔ اس کی حاکمیت کو اس وقت ٹھیس لگتی ہے جب اس کی چیخ و پکار کے باوجود بے آرامی کا سبب دور نہیں ہوتا۔ مثلاً اسے کوئی جسمانی تکلیف ہے وہ رفع نہیں ہوتی یا جو وہ کھلونا چاہتا ہے اسے نہیں ملتا، یا اسے بھوک یا پیاس ہے یا حسب منشا اسے چیز نہیں دی جاتی، لیکن اس کی حاکمیت کو توڑنے والا کون ہے؟ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا، اسے کوئی تکلیف نہ تھی، ہر ضرورت خود بخود پوری ہو جاتی تھی۔ نہ مانگنے کی ضرورت تھی نہ شور مچانے کی۔ پیدا ہونے کے بعد اس کی حاکمیت کو پہلا دھچکا لگتا ہے، تحلیلِ نفسی کے ماہرین کہتے ہیں کہ بچہ اپنی ماں کو اس نقصان کا ذمے دار گردانتا ہے اور اسے کبھی نہیں بخشتا۔ وہ کہتا ہے کہ میری حاکمیت کو توڑنے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com: مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ ماں ہی تو ہے، میں اسے مزہ چکھاؤں گا۔ یاد رکھیے اس کا قہر و غصہ اور بدلہ لینے کا عزم سب لاشعوری طور پر موجود رہتے ہیں، ان کا شعور میں آنا ضروری نہیں۔

لاشعوری طور پر وہ جان لیتا ہے کہ اس کی ماں نے اس کی حاکمیت کا طلسم توڑا اور اپنا محتاج بنا لیا، وہی دودھ دیتی، وہی اس کی دوسری ضروریات کا خیال رکھتی ہے، اور اگر وہ نہ چاہے تو اسے دودھ نہیں ملتا اور دیگر ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ وہ لاشعوری طور پر عہد کرتا ہے کہ جس طرح اس نے مجھے محتاج بنایا ہے میں بھی اسے یعنی عورت کو اپنا محتاج بناؤں گا۔ لہٰذا وہ بڑا ہو کر روزی کمانے کا فرض خود سنبھالتا ہے اور عورت کو چولہے چوکے کا کام دیتا ہے۔ اس کے خیال میں مرد کا کام کمانا ہے اور عورت کا کام گھر کی دیکھ بھال۔ اس لاشعوری خیال کے تحت ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس نے عورت کو عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا۔ مرد صرف عورت کو اپنا محتاج ہی نہیں بناتا بلکہ اس کے ہر کام کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ خواہ عورت گھر میں سارا دن کام کرے، اس کا کام یعنی بچوں کی دیکھ بھال، کھانا پکانا، گھر سنبھالنا اس کی نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دفتر میں چھ گھنٹے کی ملازمت اس قدر کٹھن اور اہم ہے کہ بیوی کے چوبیس گھنٹے کی مسلسل اور لگاتار کوفت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ بیوی کا ان داتا ہے، اس کی پرستش دیوتاؤں کی طرح ہونی چاہئے اور اگر بیوی ذرا سی نافرمانی کرے تو بغیر وجہ بتائے وہ اسے طلاق بھی دے سکتا ہے!

بچے پر خود غرضی اور خود ستائی کا عالم ہمیشہ نہیں رہتا اور نہ رہنا ہی چاہئے۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اسے اس امر کا احساس ہوتا جاتا ہے کہ خود غرضی سے کام نہیں بنتا۔ جس خاندان یا معاشرے میں وہ زندگی گزارتا ہے اس کے کچھ تقاضے ہیں، انہیں پورا کئے بغیر وہ سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ہر بچے کو شروع سے احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی کئی خواہشات اس قسم کی ہیں جو ہر بار ٹھکرا دی جاتی ہیں اور کچھ اس قسم کی جو تھوڑی بہت پوری کی جاتی ہیں لیکن مکمل طور پر کبھی نہیں۔ اسے اس امر کا بھی احساس ہوتا ہے کہ گھر میں بڑے موجود ہیں جو اسے جھڑک دیتے ہیں اور زد و کوب بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد بھی اپنے بڑے پن کا مظاہرہ بڑے شد و مد سے کرتے ہیں، اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ یہ تمام حقائق بچے کے لئے نہایت ہی تلخ ہوتے ہیں لیکن بچے کے پاس ان کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں آرام پرستی اور حقیقت دو متضاد تقاضوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا ذہنی بے چینی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالآخر ذہنی الجھن ہے۔

جب دو طاقتوں میں ٹکراؤ ہو تو یا تو ایک کو شکست ہوتی ہے اور دوسری کو فتح، یا دونوں ختم ہو جاتی ہیں، یا پھر دونوں کے مابین کوئی سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ آخری صورت میں دونوں طاقتیں زندہ رہتی ہیں لیکن دونوں کا زور کم ہو جاتا ہے۔ ان کا سمجھوتہ کبھی معقول اور کبھی غیر معقول وجوہ پر مبنی ہوتا ہے۔ چونکہ بچہ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کمزور اور بے بس ہوتا ہے، اس لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ والدین اور دیگر افرادِ خانہ اس کے مسائل کو سمجھیں اور سمجھنے کے بعد ایسا ماحول تعمیر کریں کہ اسے ذہنی الجھنوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن چونکہ اکثر والدین اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کی اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ بچوں کے مسائل کو سائنسی طریقے پر جان سکیں، لہٰذا بچے کو ذہنی کوفت سے بچنے کے لئے لاشعوری طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ جب تک ذہنی کھچاوٹ دور نہ ہو تب تک چین نصیب ہونا محال ہے۔ لاشعوری طریقوں سے چین تو مل جاتا ہے لیکن شخصیت کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ فرائڈ کا قول ہے کہ زندگی کے پہلے پانچ سال مجھے دے دیں باقی کی مجھے پروا نہیں۔ اس کے خیال میں انسانی شخصیت کی بنیاد پہلے پانچ سالوں میں رکھی جاتی ہے باقی عمر میں انہی بنیادوں پر سیرت اور کردار کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر بنیاد غلط رکھی جائے تو عمارت درست تعمیر نہیں ہو سکتی، اگر پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی ہو تو عمارت چاہے ثریا تک پہنچ جائے ٹیڑھی ہی رہے گی۔ لہٰذا نفسیاتی اعتبار سے پہلے پانچ سال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سالوں میں اگر بچے کے مسائل کو نہ سمجھا جائے تو بچہ ضرور غلط افتادہ ہوگا۔

غلط افتادگی کا مظاہرہ کئی طریقوں سے ہوتا ہے لیکن بالعموم اس کی صورتیں دو ہوتی ہیں: یا تو بچہ حد سے زیادہ مطالعہء باطن میں مشغول رہے گا یا حد سے زیادہ جھگڑالو، بدتمیز اور ناگوار۔ اگر جھگڑا کرنے کے باوجود بھی مقصد حاصل نہیں ہوتا تو یاس اور ناامیدی کا عالم طاری رہتا ہے۔

اندرونی دنیا میں محو رہنے والا بچہ اپنی کمزوری چھپانے کے لئے کئی ڈھنگ اختیار کرتا ہے:

اوّل تو دشمن کی طاقت کو اپنے مقابلے میں نہایت ہی حقیر سمجھتا ہے۔ کوئی اور شخص اس کی جگہ ہوتا ہے، وہ اپنے دل سے کہتا ہے تو وہ ایسی تحریص کے جھانسے میں آ جاتا لیکن اس پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا دل پہاڑ کی چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ ہوا کے جھونکے آتے ہیں اس سے ٹکراتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ اس طرح بچہ اپنے اندرونی قوا کا غلط اندازہ لگاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے اور حقیقت سے پرے چلا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جنگ سے گریز کیا جائے۔ جب متعدد بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو بچہ اور بڑا بھی یہ سوال کرتا ہے کہ آخر جدوجہد کا کیا فائدہ؟ کیوں نہ ہر قسم کی کوشش سے گریز کیا جائے اور گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر زندگی کے باقی ماندہ دن کاٹے جائیں۔ اس طریقِ کار کا لازمی نتیجہ حقیقت سے فرار ہی نہیں بلکہ انکار بھی ہے۔ جب یہ مرض انتہائی منزل پر پہنچتا ہے تو مریض محض جینے پر اکتفا کرتا ہے، کسی قسم کے مشاغل اسے پسند نہیں آتے۔ بعض دفعہ اسے کھانا زبردستی کھلانا پڑتا ہے، نہ بات کرتا نہ ہنستا ہے اور نہ ہی جواب دیتا ہے۔ چونکہ ذہنی طور پر وہ حقیقت سے انکار کر چکا ہوتا ہے، اس کا علاج قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ شکست کو تسلیم ہی نہ کیا جائے اور "پدرم سلطان بود" والا فلسفہ اختیار کر لیا جائے۔ حال کی تباہی پر غور کرنے کی بجائے ماضی کے شاندار کارناموں کو دہرا دیا جائے اور ان پر فخر کر لیا جائے۔ بعض بچے پیچھے کی طرف دوڑ لگاتے ہیں، یعنی ذہنی طور پر حال سے گریز کر کے ماضی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور اس میں تسکین پاتے ہیں۔ بعض بڑی عمر کے بچے رات کو بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ذہنی طور پر وہ بچپنے کی ابتدائی منزل میں ہیں مگر عمر کے لحاظ سے وہ بڑے ہو چکے ہیں۔ اکثر اوقات اپنا مقابلہ اپنے سے بدنصیب کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس امر پر شکر کیا جاتا ہے کہ میری حالت ویسی خراب نہیں، جو اس بدنصیب کی ہے اور بعض دفعہ شکست کو تسلیم نہ کرنے کے لئے خیالی پلاؤ پکانے میں وقت گزارا جاتا ہے۔ جس دشمن کو ہم حقیقی دنیا میں سر نہیں کر سکتے۔ وہ خیالی دنیا میں ہمارے سامنے چاروں شانے چت پڑا نظر آتا ہے۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ شکست کا ذمے دار کسی اور کو قرار دیا جائے، خواہ وہ انسان ہو یا ماحول۔ یہاں ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا والی مثال صادق آتی ہے۔ اپنی ناکامیوں کا باعث تقدیر، آسمان یا مادی دنیا کو سمجھا جاتا ہے اور خود انسان بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

اوپر میں نے چند ایک کرشمے باطنی دنیا میں گم ہونے کے بیان کئے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بے شمار مثالیں بچوں اور بڑوں کی زندگیوں میں ایسی ملیں گی جو باطن میں غیر معمولی شغف کا نتیجہ ہیں۔ کئی قسم کے جھوٹ، مکر اور فریب جو بچوں میں دیکھے جاتے ہیں وہ محض اس وجہ سے ہیں کہ وہ حقیقت سے انکاری ہیں اور اپنی بے بسی کو چھپانا چاہتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو بچے بہت زیادہ جھگڑالو، لڑاکے اور ناگوار بن جاتے ہیں ان کا سبب بھی غلط افتادگی ہے۔ ماحول سے عدم مطابقت کی بنا پر وہ ایسا طرزِ حیات اختیار کرتے ہیں۔ جو ان کی کمزوری پر پردہ ڈالے اور انہیں اپنے ہمجولیوں میں عزت کا مقام دے۔ جو چیز وہ شرافت اور تہذیب سے حاصل نہ کر سکے وہ دنگے فساد سے کر لیتے ہیں۔ اگر محنت اور ذہانت سے وہ استاد کی نگاہ اپنی طرف نہیں کھینچ سکے تو شرارتوں، بدعنوانیوں اور بد اطواری سے استاد کی توجہ اپنی طرف لگائے رکھتے ہیں۔ گھر میں اگر بچے کو معمولی طریقے سے توجہ نہیں ملتی تو وہ شرارت سے، شور مچانے سے، چیزیں خراب کرنے سے، حتیٰ کہ گالی گلوچ بکنے سے حاصل کرتا ہے۔

خواہ بچہ باطن میں غیر معمولی شغف رکھے یا باطن کو ٹھکرا کر جنگجویانہ طرزِ حیات اختیار کرے، اس کی ذمے داری والدین اور استاد صاحبان پر ہے اور بالآخر معاشرے پر، جس نے ایسا ماحول تعمیر کیا کہ بچہ نارمل طریقے پر پھل پھول نہ سکا۔ اس کے قوا منتشر اور مضمحل رہے اور جس زندگی کے وہ قابل تھا اس سے محروم رہا۔

بچوں کو صحیح راستے پر لانے کے لئے ضبط کی ضرورت بھی ہے۔ صرف ہم اساسی اور شفقت ہی کافی نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ والدین اپنی خامیوں کی تلافی بچوں کی مار پیٹ میں ڈھونڈیں۔ بچے پر سختی کی ضرورت تب پڑتی ہے جب پیار کے سب دروازے مسدود ہو جائیں اور اگر شروع سے ہی اس اصول پر کام کیا جائے کہ بچے لاڈ پیار سے خراب ہو جاتے ہیں تو پھر حالت بڑی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بچوں کو ضبط میں رکھنا چاہئے لیکن نظم و نسق کے بہانے ان پر تشدد نہ کیا جائے۔

ہربرٹ اسپنسر کا کہنا ہے کہ زندگی ایک توازن ہے، اندرونی اور بیرونی حالات کے درمیان، جب یہ توازن بگڑ جاتا ہے تو زندگی مصائب میں پڑ جاتی ہے۔ سکون قلب کے لئے ضروری ہے کہ بیرونی حالات سے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ بچے بھی اپنے طریقے پر ہم آہنگی کے خواہاں ہیں، لیکن چونکہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے وہ کمزور ہوتے ہیں، انہیں سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ بچہ آرام اور خوش اسلوبی سے اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہوئے، جو طریقہءِ تعلیم آٹھ دس سال کی تعلیم کے بعد بھی بچے کے اندرونی اور بیرونی عوامل میں توافق پیدا نہ کر سکے اسے ناقص سمجھنا چاہئے اور اگر ممکن ہو تو بدل دینا چاہئے۔ اسی طرح سے اگر معاشرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں متضاد رویئیں موجود ہوں، اگر حال اور ماضی کے تقاضے ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں اور علم وعمل میں زمین آسمان کا فرق ہو تو پریشانی، انتشار اور کھچاوٹ لازمی ہیں۔ باطن اور خارج میں تفاوت ہوگا اور غلط افتادگی سے شاید ہی کوئی بچ سکے۔ ان حالات کو سدھارنے میں مذہب ایک ضروری فریضہ ادا کرسکتا ہے۔ اگر مذہب دقیانوسی خیالات کا مجموعہ نہ ہو، زندگی سے گریز نہ سکھائے اور مستقبل اور ماضی کی بجائے حال پر زور دے، تو غلط افتادگی دور کرنے میں اس کا معتد بہ حصہ ہو سکتا ہے۔ جاپان میں گائیڈنس سروسز کے پروگرام میں یہ امر بھی شامل ہے کہ بچوں کو کمیونسٹوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رکھا جائے۔ چنانچہ ان کے نظامِ تعلیم میں ضمنی طور پر کئی ایسی باتیں شامل ہیں جو بچوں کو مارکسزم سے دور رکھتی ہیں۔ ہمارے ہاں اسلامک آئیڈیالوجی یعنی اسلامی نظام افکار کا بڑا چرچا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس نظامِ افکار کو عام فہم اور پریکٹیکل بنا کر اسے اپنے اصلاحی پروگرام کا پس منظر بنائیں۔ جان ڈیوی کا کہنا ہے کہ سماجی زندگی میں مذہب صف اوّل میں نہیں آنا چاہئے۔ یہ تو اس ساز کی مانند ہے جو آہستہ آہستہ بجتا ہے، جو محسوس نہیں ہوتا لیکن ساری فضا کو پُرکیف بنا دیا ہے۔ میرے خیال میں جہاں غلط افتادگی کو رفع کرنے کے لئے نفسیاتی طریقہء کار کی ضرورت ہے، وہاں صحیح اقدار کی بھی ضرورت ہے۔ ان اقدار کو مذہب سے لیا جاسکتا ہے۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کے چند عام امراض

ڈاکٹر واسطی

کسی زمانے میں تو ہم پرست لوگ، بیماری کو کسی روح کی ناراضگی، آسیب یا بھوت پریت کے اثر سے منسوب کرتے تھے۔ اور اس کا علاج دواؤں کی بجائے جھاڑ پھونک، ٹوٹکوں اور تعویذ گنڈوں سے کیا کرتے تھے۔ آج بھی وحشی و پسماندہ اقوام اور ناخواندہ طبقے میں ایسے خیالات موجود ہیں۔ بچوں کا نمونیا جسے عوام پسلی چلنا کہتے ہیں۔ مرگی، کالی کھانسی، چیچک اور سوکھے کا مرض ان بیماریوں کی چند مثالیں ہیں جن کے متعلق ضعیف الاعتقاد لوگ ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن سائنس کی ترقی کی بدولت اب یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ تمام امراض خواہ وہ بچوں کے ہوں یا بالغ افراد کے۔

(1) جراثیم

(2) غذا کے مختلف بنیادی عناصر کی کمی

(3) خلیاتِ جسم کے غیر معمولی ردعمل (ذکی الحسی یا Allergy)

(4) نفسیاتی مسائل سے پیدا ہوتے ہیں

1- جراثیم

ننھے ننھے کیڑے ہیں جو معمولی آنکھ سے نظر نہیں آسکتے اور صرف خوردبین کی مدد سے دیکھے اور شناخت کیے جاسکتے ہیں۔ بعض جراثیم تو اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ معمولی خوردبین سے بھی دکھائی نہیں دیتے اور محض دوسرے طریقوں سے ان کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کو وائرس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(Virus) کہتے ہیں۔ چیچک، خسرا، فالج اطفال اور انفلوئنزا وغیرہ ایسے ہی جراثیم سے پیدا ہونے والے امراض ہیں۔ جراثیم یا وائرس سے پیدا ہونے والی تمام بیماریاں متعدی یعنی ایک سے دوسرے شخص میں منتقل ہونے والی ہیں۔

2-غذا کے بنیادی عناصر

نشاستہ وشکر (کاربوہائیڈریٹس) چربی، پروٹین، حیاتین اور نمکیات ہیں۔ اگر غذا ناکافی اور ناقص ہو اور جسم کو ان میں سے کسی ایک عنصر کی ضروری مقدار مہیا نہ ہو تو صحت میں خلل واقع ہوتا ہے اور مختلف امراض اور عارضے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فولاد کی کمی سے انیمیا یعنی خون کی کمی، حیاتین کی کمی سے رکٹس اور حیاتین ج کی کمی سے سکروی پیدا ہو جاتی ہے۔

3-الرجی

اس سے مراد وہ کیفیت ہے جس میں جسم کے خلیات مختلف جراثیمی زہروں یا دوسرے مضر صحت مادوں کے خلاف غیر معمولی ردِعمل پیش کرتے ہیں۔ جس سے بیماری کی شکل میں مختلف علامتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دمہ، اگزیما اور پتی یعنی چھپاکی کا مرض اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔

4-نفسیاتی مسائل

جہاں تک غلط عادات اور نفسیاتی اسباب کا تعلق ہے۔ بچے کو سوسائٹی کا ایک مفید رکن بنانے کے دوران میں بہت سے نفسیاتی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بچے کے تعلقات ماں، باپ، بہن، بھائیوں، ہمسایوں اور سکول کے ہمجولیوں سے جوں جوں بڑھتے اور قائم ہوتے ہیں، بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ان کی طرف مناسب توجہ نہ دی جائے تو بسا اوقات بچہ اعصابی کش مکش اور غیر طبعی ذہنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ رات کو بستر پر پیشاب کر دینا، سکول سے بھاگ جانا، کھانے سے انکار اور ہسٹیریا وغیرہ ان غیر طبعی کیفیات کی چند مثالیں ہیں۔ جو نفسیاتی مسائل کے زیر اثر نمودار ہوتی ہیں۔

ان بنیادی توجہات کا اطلاق زندگی بھر رہتا ہے۔ بچے بالغوں کے مقابلے میں امراض میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیادہ مبتلا ہوتے ہیں اور اس کش مکش میں اپنے جسم میں اسی قدر قوتِ مدافعت پیدا کرتے ہیں جس سے افراد کو بلوغت کے کوئی تیس برس صحت و توانائی کے مل جاتے ہیں۔

بچوں کی پرورش اور امراضِ اطفال کا مطالعہ ایک نئی سائنس ہے۔ لیکن پچھلے پچاس برس میں اپنی حیران کن ترقی کی وجہ سے ایک عظیم الشان سائنس کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ بچوں کی خوراک، ان کے ذہنی نشوونما کے ارتقائی مراحل اور ایسے ہی کئی مطالعے اب پہلے کی طرح مبہم نہیں رہے۔ ان کا ماہر ہر ملک میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس مختصر مضمون میں بہت کچھ بتلانا تو ممکن نہیں لیکن ذیل میں بچوں کے چند عام امراض کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے:

اسہال (DIARRHOEA)

یہ بچوں کا نہایت تشویش ناک عارضہ ہے جو عموماً موسم گرما کے اواخر میں نہایت شدت سے پھیلتا ہے۔ بچوں میں اسہال کے تین اسباب ہو سکتے ہیں:

(1) نامناسب اور نقصان دہ غذا۔

(2) پیچش جو خاص قسم کے جراثیم سے ہوتی ہے۔

(3) مختلف متعدی امراض مثلاً چیچک، خسرا، گلے آنا، نمونیا، گردوں کی سوزش وغیرہ جن میں زہریلے مادے آنتوں اور معدے سے خارج ہوتے ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر دستوں کا عارضہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اکثر دودھ اور دودھ ملانے کے سامان کی مناسب صفائی نہ ہونے کی وجہ سے گرد و غبار اور مکھیوں کی وساطت سے خطرناک قسم کے جراثیم بچے کے معدے اور آنتوں میں سرایت کر کے خارش اور سوزش پیدا کر دیتے ہیں۔ جن کے باعث شدید اسہال اور ہیضے کی سی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور بچہ بہت جلد کمزور اور نڈھال ہو جاتا ہے۔ دست خواہ کسی وجہ سے بھی ہوں تین خطرناک نتائج کے ذمہ دار ہوتے ہیں:

اول جسم سے پانی کا غیر معمولی اخراج جس سے جسم کے زہریلے مادے گاڑھے ہو کر اعضائے رئیسہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

دوسرے نمکیات کے ضائع ہونے سے جسمانی بافتوں کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔

تیسرے حیاتین اور دیگر عناصر غذائیہ مثلاً پروٹین وغیرہ کی کمی سے جسم کی نشوونما رک جاتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

علامات

عموماً اس کا حملہ شدید قے سے شروع ہوتا ہے۔ پھر دست بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ جو اول سبز رنگ کے اور پھٹے ہوتے ہیں لیکن جلد ہی چاولوں کی پیچ کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ان میں بچے کے جسم سے پانی کی کثیر مقدار خارج ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچہ بہت جلد کمزور اور پیلا پڑ جاتا ہے۔ اور ٹمپریچر بہت زیادہ حتیٰ کہ 102 سے 103 درجے تک بڑھ جاتا ہے۔ تالو پچک جاتا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنس جاتی ہیں۔ جلد کی طبعی لچک مفقود ہو جاتی ہے۔ اور پیشاب بند ہو جاتا ہے۔ اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو سانس بے قاعدہ چلنے لگتا ہے۔ تشنج طاری ہوتا ہے اور آخر کار موت واقع ہو جاتی ہے۔

علاج

ابتدا میں کیسٹرائل کا جلاب دینا مناسب ہے بشرطیکہ بہت زیادہ دست نہ آ چکے ہوں۔ اگر دست شدید ہوں تو جلاب نہ دیں بلکہ جسم سے ضائع شدہ پانی کی تلافی کی کوشش کریں اور پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر بار بار پلائیں۔ اگر قے کی شدت کے باعث پانی معدے میں نہ ٹھہرے اور کمزوری بڑھتی جائے تو سٹامک واش کرنا اور جسم میں نارمل سیلائن (سیال نمکین) داخل کرنا ضروری ہے۔ جس کے لئے ایک ماہر معالج کی خدمات درکار ہوں گی۔ بیماری کی شدت کے باعث بچہ خود ہی بہت کم دودھ پیتا ہے۔ تاہم دودھ کی مقدار کم کر دینا یا مقدار حسب سابق رکھتے ہوئے اس میں پانی کا تناسب بڑھا دینا کافی ہوتا ہے۔ مکمل طور پر بند کر دینا مناسب نہیں۔ اس سے بچہ بہت جلد کمزور ہو جاتا ہے، البتہ گلوکوز بالکل بند کر دینا چاہئے۔ کیونکہ یہ آنتوں میں جراثیم کی افزائش اور تخمیری کیفیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ سلفا گوانا ڈین کا استعمال مفید ہوگا۔ ایک سال کے بچے کو نصف سے ایک گولی تک ہر دو، دو گھنٹے کے بعد دینا مناسب ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی دوائیں زیر استعمال ہیں جن میں کلورو سٹریپ قابل ذکر ہے۔

بچوں کو اسہال کے عارضہ سے بچانے کے لئے دودھ اور دودھ پلانے کے سامان کو جراثیمی آلودگی سے محفوظ رکھیں۔ بوتل، چوسنی، چمچہ، بوتل برش اور پیالی وغیرہ کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈبو کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھیں اور جب ضرورت ہو تو ہاتھوں کو گرم پانی اور صابن سے خوب اچھی طرح دھو کر اور تولیہ وغیرہ سے پونچھ کر ہی ان چیزوں کو ہاتھ لگائیں۔ دودھ کو ہمیشہ ایک دو منٹ تک جوش دے کر استعمال کریں اور اُسے مکھیوں اور گرد وغبار سے بچانے کے لئے نہایت احتیاط سے ڈھانک کر رکھیں۔

کیچوے اور چمونے

یہ کیڑے بچوں میں عام ہوتے ہیں لیکن ایسی علامات نمایاں نہیں ہوتیں جن سے ان کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ کیچوے چھوٹی آنتوں میں رہتے ہیں۔ اور اپنے مقام سے گزر کر بڑی آنتوں کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ اور قے کے ساتھ بھی خارج ہو سکتے ہیں۔ چمونے چھوٹے چھوٹے دھاگوں کے ٹکڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ تر اوپر کی آنت میں رہتے ہیں لیکن عموماً آخری آنت میں پہنچ کر پاخانے کے مقام پر بیرونی جلد اور متصلہ کپڑوں پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور مرنے سے پہلے وہاں اپنے انڈے چھوڑ دیتے ہیں جس سے خارش ہوتی ہے اور جب بچہ اس مقام پر کھجلاتا ہے تو یہ انڈے اس کے انگلیوں کی پوروں اور ناخنوں میں لگ جاتے ہیں۔ جو غذا کے ساتھ پھر پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔

علامات

بھوک کی کمی، چہرے کی زردی، دردِ سر، دانت پیسنا اور سوتے میں ڈرنا، پاخانے کے مقام پر خارش کا ہونا خصوصاً رات کے وقت سوتے اور بستر پر پیشاب کرنا وغیرہ۔

علاج

کیچوؤں کے لئے سینٹونین بہت مؤثر دوا ہے۔ جو آدھ سے دو گرین روزانہ رات کو سوتے وقت دی جا سکتی ہے۔ تین رات مسلسل دی جائے تو کیچوے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہیپرازین اور پیپرازین وغیرہ بھی دریافت ہو چکی ہیں ان کا استعمال قابل ذکر ہے کیونکہ یہ چمونوں پر بھی اثر کرتی ہے۔ چمونوں کے لئے جینشن وائیلٹ ___(Gention Violet) عموماً زیادہ کامیاب رہتی ہے۔ 1/6 گرین کے وزن کے کیپسول بنائے جاتے ہیں۔ چھ سال تک ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیپسول فی سال کے حساب سے دیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ ایک پائنٹ پانی میں ایک بڑے چمچے کے برابر نمک حل کر کے اس کا انیما کرنا بھی ایک اچھا علاج ہے۔لیکن اس کا علاج ہر روز یا ہر دوسرے دن کی بجائے چوتھے پانچویں روز کیا جائے تو بہتر ہے۔

رِکٹس ــــ(کساح)

یہ بیماری ہڈیوں کے اندر کیلشیم کے ناکافی طور پر جمع ہونے اور ناقص طور پر جزو بدن بننے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اس میں ہڈیاں نرم پڑ جاتی ہیں۔اور جسم کے بوجھ سے خم کھا کر ٹیڑھی اور بدوضع ہو جاتی ہیں۔ چھاتی کی ہڈیاں بھی پچک جاتی ہیں، جس سے تنفس پر بُرا اثر پڑتا ہے۔دانت کمزور ہو جاتے ہیں اور بے قاعدہ اور ٹیڑھے نکلتے ہیں۔اور جلد گر جاتے ہیں۔کیلشیم کے جزوِ بدن بننے کے لئے حیاتین 'ڈ' کا ہونا ضروری ہے۔رکٹس میں حیاتین 'ڈ' کا ہونا ضروری ہے۔رکٹس میں حیاتین د کی نمایاں کمی ہوتی ہے۔اس لئے کیلشیم فاسفورس کی مقداریں جسم میں غیر متوازن ہو جاتی ہیں۔یہ حیاتین چربی والی غذاؤں مثلاً مکھن، کاڈلیور آئل، اور خالص گھی میں پائی جاتی ہیں اور جلد پر سورج کی ایک خاص قسم کی شعاعیں (Ultra Violet Rays) کے پڑنے سے جلد کے اندر خود بخود بھی تیار ہوتی ہے، اس لئے حیاتین 'ڈ' پر مشتمل غذاؤں اور سورج کی روشنی کا میسر نہ آنا رِکٹس کے بنیادی اسباب ہیں۔

ہمارے ملک میں لوگ غربت کی وجہ سے اصلی گھی اور مکھن کو چھوڑ کر بناسپتی گھی استعمال کرتے ہیں۔بناسپتی گھی اور تیلوں میں حیاتین 'ڈ' بالکل نہیں ہوتی۔دوسرے ممالک میں بناسپتی گھی کے اندر حیاتین 'ڈ' کا اضافہ کرنا قانوناً ضروری نہیں ہے۔لیکن ہمارے ہاں ابھی تک ایسا کوئی قانون نہیں۔اس کے علاوہ ہمارے ملک میں بچوں کو دودھ بہت پتلا کر کے دینے کا رواج عام ہے۔اس لئے ہمارے ہاں رکٹس کا خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

علامات

ابتدا میں نزلہ، برانکائیٹس اور نمونیا کے بار بار حملے ہوتے ہیں۔اسہال کے دورے بار بار پڑتے ہیں۔سر میں پسینہ زیادہ آتا ہے، بچے کا سر چوکور اور چپٹا ہو جاتا ہے۔اور سر کا تالو غیر معمولی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاخیر سے بند ہوتا ہے۔ بچہ دیر سے چلنا سیکھتا ہے۔ دانت بھی تاخیر سے اور بے قاعدہ نکلتے ہیں۔ بعض بچوں میں خون کے اندر کیلشیم کم ہونے کے باعث اعصابی علامات مثلاً تشنج اور تنفس کا بند ہو جانا وغیرہ نمودار ہوتی ہیں۔ کلائیوں، ٹخنوں اور پسلیوں کے سرے زیادہ موٹے ہو جاتے ہیں۔ اور ہڈیاں خصوصاً لمبی ہڈیاں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ چھاتی کا اگلا حصہ سامنے کو اُبھر آتا ہے۔ جس سے سینہ کبوتر کے سینے کی مانند نظر آتا ہے۔ دانت کمزور ہوتے ہیں، بے قاعدہ نکلتے ہیں۔ اور جلد گر جاتے ہیں، کولہوں کی ہڈیاں بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ یہ کیفیت لڑکیوں میں بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ پیڑو کا قطر اس قدر تنگ اور بے قاعدہ ہو جاتا ہے کہ استقرار حمل کے بعد مجبوراً پیٹ چاک کر کے بچے کو باہر نکالنا پڑتا ہے۔

احتیاط

دودھ کو زیادہ پتلا نہ کریں، دوسرے مہینے سے پہلے ہی بچے کو مچھلی کے تیل کے چند قطرے یا کاڈلیور آئل ایمشن دینا شروع کر دیں۔ حیاتین 'ڈ' کا نام نہاد اشتہاری دواؤں سے حیاتین 'ڈ' کی کمی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں یہ حیاتین برائے نام ہوتی ہیں۔ مثلاً کپلرز کاڈلیور آئل۔ آسٹو مالٹ اور فیرڈول وغیرہ ایسی اشتہاری دواؤں کے نام ہیں۔ تجارتی ادارے زیادہ نفع کمانے کی غرض سے شکر کے گاڑھے قوام میں خفیف سی حیاتین 'ڈ' شامل کر کے مہنگے دام وصول کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ ملخص (Coneentrats) حیاتین 'ڈ' مثلاً ایڈیکسولین، ریڈیوسٹولیم، وائی ڈیلٹا، ڈاگراوٹ یا آسٹولین وغیرہ دینی چاہیے۔

علاج

بچے کو تازہ ہوا اور دھوپ سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع دیں۔ اس کے جسم پر روزانہ مچھلی کا تیل مل کر کچھ دیر کے لئے دھوپ میں بٹھا دیا کریں یا الٹراوایولیٹ ریز دلوائیں۔ خون کی کمی دور کرنے کے لئے غذا میں فولاد دیں۔ اس کے لئے فیری ایٹ ایمونیا سائٹراس 2 سے 3 گرین تک پانی میں ڈال کر غذا کے بعد دیا کریں۔ حتی الوسع ماں کا دودھ نہ چھڑائیں۔ اگر مرض کی ابتدا ہو چکی ہو تو بچے کو چلنے پھرنے سے روکیں۔ تاکہ جسم کے وزن سے ہڈیاں ٹیڑھی نہ پڑ جائیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قارئین دیکھیں گے کہ بچوں کے امراض میں حفاظتی تدابیر کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ بچے کی نشوونما ایک خاص ماحول میں ہی بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی اقتصادی بدحالی اور سماجی انصاف کا فقدان بچوں کے لئے ناسازگار حالات کے باعث بنتے ہیں۔ اسی لئے امراض اور اموات کی شرح برصغیر پاک و ہند میں دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ یہ شرح اس امر کی آئینہ دار ہے کہ ہمارے ماحول میں صفائی نہیں، صاف پانی میسر نہیں گردوغبار سے بچاؤ ممکن نہیں، آبادی گنجان ہے اور گندے پانی اور فضلے کے نکاس کے خاطر خواہ انتظامات مفقود ہیں۔ اس صورتِ حالات سے محکمہ حفظانِ صحت کی کارکردگی کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل، مسلّم امر یہ ہے کہ روپے پیسے کا بہترین مصرف بہبودیِ اطفال کے لئے اس کا استعمال ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھیل اور بچے کی تعلیم

منور جہاں رشید

انسان اور تمدن کی ابتدا سے بچے کھیلتے چلے آئے ہیں۔ ان کے کھیلوں کی تفصیل ہر عہد کے ادب میں پائی جاتی ہے۔ ہر عہد کے بچوں نے کھیل دوسرے بچوں کے لئے بطور ورثہ چھوڑے ہیں۔ ہر عہد کے بچوں نے اس ورثے میں اپنی جدتِ طبع کے تحت کھیلوں میں نئی اختراعات کی ہیں۔ بچے کی جسمانی نشوونما کے اصول، دماغی تربیت اور صحت کے قانون ہر ملک اور ہر عہدِ زمانہ میں یکساں رہے ہیں۔ انسانی زندگی خواہ زمانے کے کسی عہد اور دُنیا کے کسی حصے میں ہو، ایک ہی خدا کی قوتِ تخلیق کا ظہور ہے۔ اُس کے بننے اور بگڑنے، صحت مند پرورش اور پَروان چڑھنے کے ایک ہی اُصول ہیں۔

بچوں کے کھیل ایک عجیب وغریب معمہ ہیں۔ ان کو سمجھنا آسان نہیں۔ جب بچہ کھیل میں ایک گھریلو منظر پیش کرتا ہے یا جھوٹ موٹ کی جنگ کرتا ہے تو کون جانے اس کے شعور اور لاشعور میں کیا جذبات طوفانی صورت پکڑ رہے ہیں__ یہ احساسات ایسے راز سربستہ ہیں جن میں زندگی کا فلسفہ کوزے میں دریا ہے۔ ان کو سمجھنا حقیقت بین فلسفی کے لئے بھی مشکل ہے۔ انگلستان اور یورپ کے ماہرین تعلیم نے بچوں کے کھیل کا بہت غور وخوض سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے مشاہدات اور تجربات نے ثابت کیا ہے کہ بچے کا کھیل اس کی خوشی ہی نہیں بلکہ اس کی تندرست پرورش کا پہلا اصول ہے۔ کھیل کو بنیادی دماغی تندرستی اور اعصابی توازن میں بہت دخل ہے۔ ہر تعلیم کے ماہر کو بچے کی کھیل کی اہمیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ فروبل پہلا ماہر تعلیم تھا جس نے یہ فتویٰ دیا کہ کھیل تعلیم کا بہترین آلہ کار ہیں۔ کھیل بچے کے ہر قسم کے احساسات اور خواہشات کی سچی تصویر ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہربرٹ سپنسر کا خیال ہے کہ بچے کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ ذہانت، طاقت اور جدّت کا ظہور کھیل کی تخلیق کا موجب ہے۔ کارل گروس نے کھیل کو سات بڑی اور ساٹھ چھوٹی قسموں میں منقسم کیا ہے۔ کھیل انسانی جبلتوں کا مظہر ہے۔ سٹینلی ہال نے کہا ہے کہ بچہ انسانی ارتقاء کے مدارج کھیل میں بیان کر جاتا ہے۔ کھیل حرکات کا ایسا مجموعہ ہے جن میں قوم کی ماضی کی جھلک ہے۔

دو سال سے پانچ سال تک کی عمر کا بچہ مختلف کھیل کھیلتا ہے اور ہر کھیل کا مختلف مقصد ہے۔ ڈاکٹر ڈاون فیلڈ کا خیال ہے کہ بچہ کچھ کھیل جسمانی نشوونما کے لئے اور ورزش کے لئے کرتا ہے۔ گیند اُچھالنا، پھینکنا اور کھیلوں سے جسمانی حرکات اور اُن کا توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچے کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بزرگوں کی مدد کا محتاج نہ ہو، ہر کام میں خودمختار ہو، آزاد ہو، اپنے ماحول کی اور اپنی دیکھ بھال خود کر سکے۔ اس کے لئے ایک کام کرنے کے بعد اُن کاموں کو بار بار دُہراتا ہے تاکہ مہارت حاصل کر سکے۔ ان میں ایسے کھیل شامل ہیں۔ جیسے بٹن بند کرنا، کھولنا، ہاتھ دھونا، ناخن صاف کرنا، کنگھی کرنا، جوتوں کے تسمے بند کرنا، کھولنا، پانی بھرا گلاس لے کر جانا، میز صاف کرنا، روغن کرنا، جھاڑو دینا وغیرہ۔ پھر کچھ ایسے کھیل ہیں جو کہ اس کی خیالی دنیا کی جھلک ہیں۔ بچے کا تخیل بلند و وسیع ہے۔ اس دنیا میں اپنی خواہشات کو جھوٹ موٹ میں پورا کر لیتا ہے۔ بچہ اس خیالی دُنیا میں کھیل کے ذریعے اپنے تفکرات اور دُکھے ہوئے جذبات کو ہلکا اور ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ وہ گڑیا سے وہی سلوک کرے گا اور اُس کو وہی جسمانی اور ذہنی اذیت دے گا جس کا وہ خود شکار ہو چکا ہے۔ گڑیا کو اُن کرداروں سے مشابہ کر سکے گا جو اس کی اذیت کا باعث ہوئے ہیں۔ اُس کو وہ مار اور سزا دیگا جو اس نے خود کھائی ہے۔ کھیل کے ذریعے جھوٹ موٹ کا بدلہ لے کر اپنی طبیعت کو ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ یہ دُکھی جوشیلے جذبات اگر حقیقت میں کچھ نہیں تو خیالی دنیا میں اپنا بدلہ نکال کر لوگوں کو کچھ آرام دیتے ہیں۔ بچہ اپنی زبردست خواہشات کو بھی اس جھوٹ موٹ کی دنیا میں پورا کرتا ہے۔ گھوڑے کی سواری کا شوق چڑھتا ہے تو ایک لکڑی اُٹھا کر اُس کا گھوڑا بنا لیتا ہے اور لکڑیوں پر یوں پھلانگتا ہے کہ گویا گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ بچے دکان لگا کر دکان دار بن کر خرید و فروخت کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہاں پر حساب، گنتی، تول، ناپ وغیرہ کا خیال اور کھیل کھیل میں حساب کی تعلیم کی ابتدا کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جھگڑوے کے مالک کا بچہ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر چھکڑے پر جاتا ہے تو وہ باگیں پکڑ کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ چلا رہا ہے۔ دھوبی کا بچہ باپ کے ساتھ سر پر گٹھڑی رکھ کر چلتا ہے۔ مالی کا بچہ باپ کے ساتھ باغبانی کرتا ہے۔ بچہ اوزاروں سے کام کرتا ہے۔ یہ کام اُس کا کھیل ہے اور وہ خوش ہوتا ہے۔ ایک چپڑاسی کے بچے کو کمرہ صاف کرنے کے لئے کہا گیا وہ بہت خوشی خوشی بکس کرسیاں اور میزیں صاف کرتا رہا۔ تمام فرنیچر کی دیکھ بھال کی۔ پھر بڑے چپڑاسی کی طرح بعض اشیاء کو سر پر رکھ کر چلتا رہا۔ یہ بچے کی دماغی تندرستی کا ثبوت ہے۔

بچوں کو ذائقہ سے لطف اندوز ہونے کی بہت عادت ہے۔ چیز منہ میں ڈالی اور مزہ معلوم کیا۔ پانی کے بلبلے بنا بنا کر اُڑانا، صابن گھول کر جھاگ میں بلبلے اُڑانا بہت مرغوب کھیل ہے۔ ایک بچے کو پوچھا کہ وہ پانی میں بلبلے کیوں اُڑاتا ہے تو وہ کہنے لگا کہ اس کا مزہ انناس جیسا ہے۔ ایک بچہ کتاب میں تصویریں دیکھتا گویا وہ اپنے خیال میں پڑھ رہا تھا۔ ناخن منہ سے کاٹ رہا تھا۔ اس کو منع کیا گیا تو کہنے لگا ''کیوں بند کروں، اس کا تو مزہ لذیذ ہے۔'' کچے آلو، پیاز، پتے، درختوں کی چھال، مصالحے، کارک وغیرہ کو منع کرنے پر بھی داؤ لگائے جاتے ہیں۔ دراصل اسی طرح اپنی معلومات وسیع کرنے میں آنکھ کی بینائی سے بھی تجربہ کرنے کی عادت ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر کھیلنا گویا یہ معلوم کرنا کہ اندھیرے میں کیا حال ہوتا ہے۔ رنگوں کے انتخاب کے لئے رنگوں سے کھیلنا، رنگ بھرنا وغیرہ۔ ہر چیز سونگھنے کا شوق، عطر خوشبویات اور ہر چیز جو ہاتھ آجائے اس کو ناک تک پہنچا دینا دراصل دُنیا کا ماحول بچے کے لئے نیا ہوتا ہے۔ اس کی ہر چیز نامعلوم ہوتی ہے۔ قدرت کی ودیعت کی ہوئی ذہانت بیساختہ ہر چیز کا پتہ لگانے کے لئے ہوتی ہے اور بچہ آئندہ زندگی کے تجربات کے لئے تیار رہتا ہے تا کہ آئندہ ذمہ داریاں بخوبی سنبھال سکے۔

کچھ ایسے کھیل ہیں جو بہت سے بچے مل کر کھیلتے ہیں۔ ان کھیلوں میں باہمی تعاون، رہنمائی، رہنما کی مدد کرنا وغیرہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کھیل بچے کو روزمرہ کی زندگی اور میل جول کے لئے تیار کرتے ہیں۔

کھیل کو ہنسی سے بہت تعلق ہے بچے کا خوش ہونا ایک اہم چیز ہے، تاہم اُستاد کو اس بات کی نگہداشت کرنی ضروری ہے کہ مزاج بدتہذیبی کا رنگ نہ پکڑے۔

بچے کے کھیل کے لئے سامان ضروری ہے یہ سامان ماحول میں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ بچے کی نفسیاتی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ اور بچہ خوشی اور آزادی سے کھیل چُن کر مشغول ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائے۔ کچھ سامان قدرت نے مہیا کیے ہیں، مثلاً پانی، ریت، مٹی وغیرہ ایسے ہی رڈی اخباریں جن سے بچے تصویریں کاٹ سکیں۔ بہت مفید کام دے سکتی ہیں۔ نقاشی، ڈرائنگ، گانا بجانا، ناچنا، باجا بجانا وغیرہ چند ایسے شغل ہیں جو بچے کے لئے تعلیمی اور نفسیاتی اہمیت رکھتے ہیں۔

جسمانی تربیت کے لئے انگلستان میں کئی قسم کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ مثلاً سلائیڈ، سیڑھیاں، سی سا، بڑے تختے جو زمین سے کچھ اونچے ٹھوک دیئے گئے ہوں۔ دھکیلنے والے کھلونے چھوٹی موٹریں، گاڑیاں، سامان لادنے والے چھکڑے، پہیئے دار خرگوش، پہیئے دار گھوڑے، گدھے، بکس، بغیر پہیئے کے بکس، چریم گیند، جھولے، جنگل جیم وغیرہ۔ بچے کو چلنے، بیٹھنے، اُٹھنے اُٹھانے، نیچا کرنے، بوجھ لاد کر لے جانے، ہلانے، کھینچنے، دوڑنے چڑھنے، پھیلنے، توازن قائم کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ تمام سامان اس ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ بچوں کو کھودنے اور ٹھوکنے میں دلچسپی ہے۔ اُس کے لئے باغبانی کے اوزار ہیں۔ علاوہ ازیں دھکیلنے کے لئے کئی قسم کے پہیئے دار کھلونوں کے علاوہ ٹرائیکل، جھولنے والے گھوڑے، کشتیاں، چھکڑے اور گیند شامل ہیں۔ جو جسمانی نشو ونما اور توازن کے لئے مفید ہیں۔

حواس خمسہ کی معلومات کے لئے کئی قسم کی لکڑی کی اینٹیں ہیں۔ کچھ سیدھی سلاخیں ہیں۔ کچھ تکونیں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی قسم کی اینٹیں ہیں۔ کچھ پرانا سامان بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً بکس، ریلیں، کارک، کئی قسم کے کپڑے، ریشمی، سوتی، ساٹن، مخمل وغیرہ بچہ چھو کر فرق محسوس کر لیتا ہے۔ رنگوں کی شناخت کے مختلف قسم کی جگ سا معمہ جن میں لکڑی کے ٹکڑوں پر مختلف تصاویر بنی ہیں۔ ان ٹکڑوں کو جوڑ کر بعض اوقات کوئی منظر بن جاتا ہے اور بعض اوقات کوئی ایک جانور، مثلاً ہاتھی گھوڑا وغیرہ یا مکان یا بحری جہاز، ہوائی جہاز وغیرہ۔ ان لکڑی کے رنگین ٹکڑوں کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور بعد میں بچہ اُن کو درست جوڑ کر بامعنی تصویر یا منظر بنا لیتا ہے۔

خیالی اور جھوٹ موٹ کھیل کے لئے گڑیاں، گڑیوں کے گھر، گھر کا سامان، چائے کا سامان، چولھے، کھانا پکانے کے برتن و دیگر اشیاء موجود ہیں۔ اکثر بچے سچ مچ کھانا پکاتے ہیں۔ مہمان مہمان کھیلتے ہیں۔ بچوں نے مجھے سی ایسی دعوتیں دی ہیں۔ کپڑے رکھنے کے بکس، ڈرائنگ رُوم کا فرنیچر، غسل کا سامان، ٹب، جھاڑو اور صفائی کا سامان، مٹی کے پھل اور سبزیاں، ترازو، ٹیلیفون، کارڈ بورڈ کے روپے پیسے، کاغذ کے بیگ، مختلف قسم کے کپڑے جو رجٹ، کاٹن، چھینٹ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے کپڑے، ٹوپیاں، چھتریاں، دستانے، خرید وفروخت کے لئے ٹوکریاں بھی ہیں۔ بچے ان سے قسم قسم کے کھیل کھیلتے ہیں۔ بڑوں کی نقل میں جھوٹ موٹ کی پارٹیاں کرتے ہیں۔ ڈنر دیتے ہیں۔ گڑیا لٹادی جاتی ہے۔ جھوٹ موٹ کا ڈاکٹر آتا ہے۔ ٹیکا لگتا ہے، علاج ہوتا ہے۔ عزیز عیادت کو آتے ہیں۔ باقاعدہ بیماری کی کہانی سنائی جاتی ہے کہ بچی بہت اچھی ہے۔ بالکل شریر ہیں۔ اتفاق سے ہوا لگ گئی۔ بیمار ہوگئی۔ دوا پی ہے خدا کرے آرام آجائے۔ ایک سہ سال یا چہار سالہ بچی اپنی ماں کا پارٹ خود ساختہ فی البدیہہ ڈرامے میں بخوبی ادا کر جاتی ہے۔ میں ان ڈراموں میں کئی دفعہ شریک ہوئی ہوں۔

بچوں کو ریت اور مٹی سے کھیلنے کا بہت شوق ہے۔ سکولوں میں کناروں دار میزوں پر ریت بچھی ہے یا ٹرے میں ریت ہے۔ اور یہ ٹرے ایک میز پر رکھی ہے۔ باہر میدان میں ایک خوب بڑا گڑھا کھود کر اُس میں ریت بھر دی گئی ہے۔ بچوں کو آزادی سے کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ بچے گلاس میں ریت بھرتے ہیں پھر گلاس کو خالی کر دیتے ہیں۔ اکثر ریت کو گیلا کر کے گیند بنا کر اُچھالتے ہیں۔ چھلنیاں، نالیاں، ترازو، وزن کے پیمانے، کاغذ کی تھیلیاں، چھوٹے خالی ٹین کے ڈبے بچوں کو دیئے جاتے ہیں اور وہ ریت سے کھیلتے ہیں۔ اس آزادانہ کھیل سے بچوں کے خیالات اور اندرونی تکالیف کا پتہ چلتا ہے۔ ریت میں کھیل کے لئے وہ پرانے اور خود ساختہ بنائے ہوئے سستے سامان کا استعمال کرتے ہیں۔

پانی کا کھیل بھی بچے کی تعلیم ونشوونما کے لئے مفید ہے اور بچے کو بہت مرغوب ہے۔ ایک میز پر ایک چوڑے ٹب میں پانی ڈال کر کھیل کے کمرے میں رکھ دیتے ہیں لیکن اکثر سکولوں میں ایک بہت کم گہرا تالاب بنا ہوا ہے، جس میں پانی ہوتا ہے۔ بچے اپنے کھلونوں سمیت اُس میں گھس جاتے ہیں اور خوشی سے کھیلتے ہیں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ ربڑ کی نالیاں پانی سے بھرتے ہیں اور خالی کرتے ہیں۔ پانی میں صابن گھول کر بلبلے اُڑاتے ہیں۔ اپنی ربڑ اور سیلولائیڈ کی گڑیاں نہلاتے ہیں۔ چھلنیاں لے کر پانی انڈیلتے ہیں، گلاس یا ڈبے میں پانی بھرتے ہیں، پھر خالی کرتے ہیں۔ یہ کھیل بچوں کو مرغوب ہے۔ پانی میں چھلانگتے ہیں، تیرتے ہیں، اپنے کھلونے دھکیلتے ہیں، کاغذ کی کشتیاں تیراتے ہیں۔

چکنی مٹی تمام سکولوں میں مہیا کی جاتی ہے۔ بچے اس مٹی کی کیک، پیسٹری، جانور اور وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چیزیں جواُن کے دماغ میں آئیں بناڈالتے ہیں۔ یہ بہت سستا اور مرغوب کھیل ہے۔

بچوں کو پھولوں اور قدرت کے مطالعے کا شوق ہوتا ہے۔ تمام سکولوں کے سامنے بڑے گراؤنڈ ہیں۔ باغ ہیں، جن میں قسم قسم کے درخت ہیں۔ پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ بچے باغبانی کرتے ہیں۔ زمین کھودتے ہیں، کھاد ڈالتے ہیں، پانی دیتے ہیں، صفائی کرتے ہیں۔ پھلوں کے پودوں کو اُگتے، بڑھتے اور مرجھاتے دیکھتے ہیں۔ اور نباتات میں زندگی کا بلاارادہ و بے ساختہ مطالعہ کرتے ہیں۔ کچھ پرندے پال رکھتے ہیں۔ ان کو دانہ چوگا دیتے ہیں اور قدرت کی عظمت دیکھ کر خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس طرح تخلیق کائنات سے باخبر ہوتے ہیں۔

بچوں کو رنگوں کا بہت شوق ہوتا ہے، ایک لکڑی کے تختے پر ایک کاغذ چپکا دیتے ہیں۔ بسا اوقات یہ کاغذ کسی پُرانے اخبار کا ایک ورق ہوتا ہے۔ بچے کو رنگ اور بُرش دے دیا جاتا ہے۔ تاکہ بچے آزادانہ جو جی چاہے کھینچیں۔ یہ آزادانہ ٹیڑھی میڑھی بدنما لکیروں کی نقاشی بہت اہم ہے۔ اس سے بچے کی اندرونی احساسی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ خاص رجحان کا پتہ چلتا ہے، جو تعلیمی نقطۂ نظر سے اہم ہے اور نفسیاتی طور پر پریشان بچے کی تکالیف ان آزادانہ کھینچی ہوئی تصویروں سے واضح ہو جاتی ہیں۔

ہر سکول کے ساتھ میدان ہے۔ اس میدان میں باغ اور گراؤنڈ موجود ہے۔ جہاں پر چھوٹے اور بڑے درخت ہیں، درختوں پر بچے چڑھ بھی سکتے ہیں۔ اس میدان میں بچوں کے کھیل کا سامان پھیلا دیا جاتا ہے۔ ڈرم، خالی ڈبے، بڑے چھوٹے، ہلکے لکڑی کے پُرانے صندوق، چھوٹے پرانے کھوکھے، پتلی بے کار چپٹیوں کو جوڑ کر بنائے ہوئے چھوٹے بکس، یہ چیزیں میدان میں رکھ دیتے ہیں۔ بچے ڈبوں میں بیٹھ کر جھوٹ موٹ کی موٹر، ہوائی جہاز اور ریل بنا کر سفر کرتے ہیں۔ ایک سکول میں میں نے بچوں کو بی امی کا چرخہ گا کر سنا دیا۔ بس وہ تو میرے بہت دلارے دوست بن گئے۔ جیسے کہ اپنے ملک کے بچے بن جاتے ہیں اور میرا اٹیچی کیس اٹھا کر میرے ساتھ چل دیئے۔

اس باغ کے میدان میں باڑیں ہیں۔ کچھ سایہ دار کونے ہیں، کچھ پہاڑیاں ہیں جو مصنوعی ہیں۔ جن پر پھول بھی ہیں اور پاس بیٹھ کر کھیلنے کو جگہ بھی ہے۔ یہاں بچے اپنے دل پسند سامان سے کھیلتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کو بڑوں کی طرح بیٹھنے اور کام کرنے کا بہت شوق ہے۔ ماں باپ بننا، دکاندار، درزی، دھوبی، سپاہی، ڈاکیہ بننا اُن کا بہت پسندیدہ کھیل ہے۔ یہ کاغذ کی وردیاں یا ٹوپیاں بھی بنا لیتے ہیں۔ بڑوں کی طرح بیٹھ کر کتابیں جھوٹ موٹ پڑھنے لگتے ہیں۔ ان کی کتابیں زیادہ تر تصاویر ہیں۔ جو ان کے روزمرہ کے مشاہدے میں شامل ہیں۔ بعض حلقوں میں ہر جانور کی بچپن سے بڑے ہونے تک کی مسلسل تصاویر ہوتی ہیں۔ مناظر کی تصاویر بھی بچوں کی دلچسپی میں شامل ہیں۔

بچوں کے کھیل میں سرتال کو بہت دخل ہے۔ بچوں کو طبعاً راگ اور سُر تال سے لگاؤ ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی سیٹیاں، بگل، چھوٹے ڈھول، چھنکنے، پیانو کے ساتھ سُر تال میں آزادانہ بجاتے ہیں۔ ان کو پُرکشش بینڈ کہتے ہیں۔ اس باجے کے ساتھ ناچتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

○

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

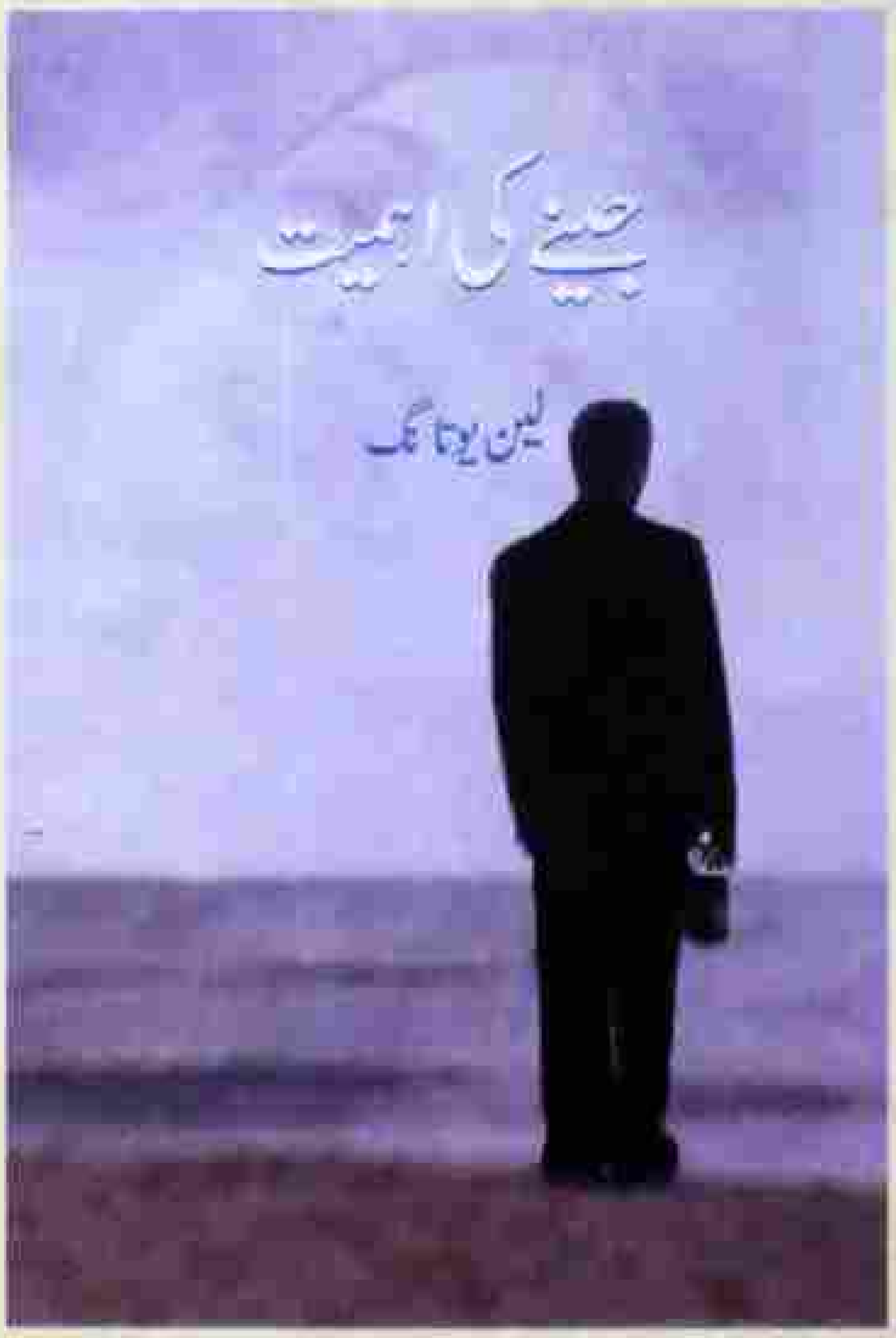

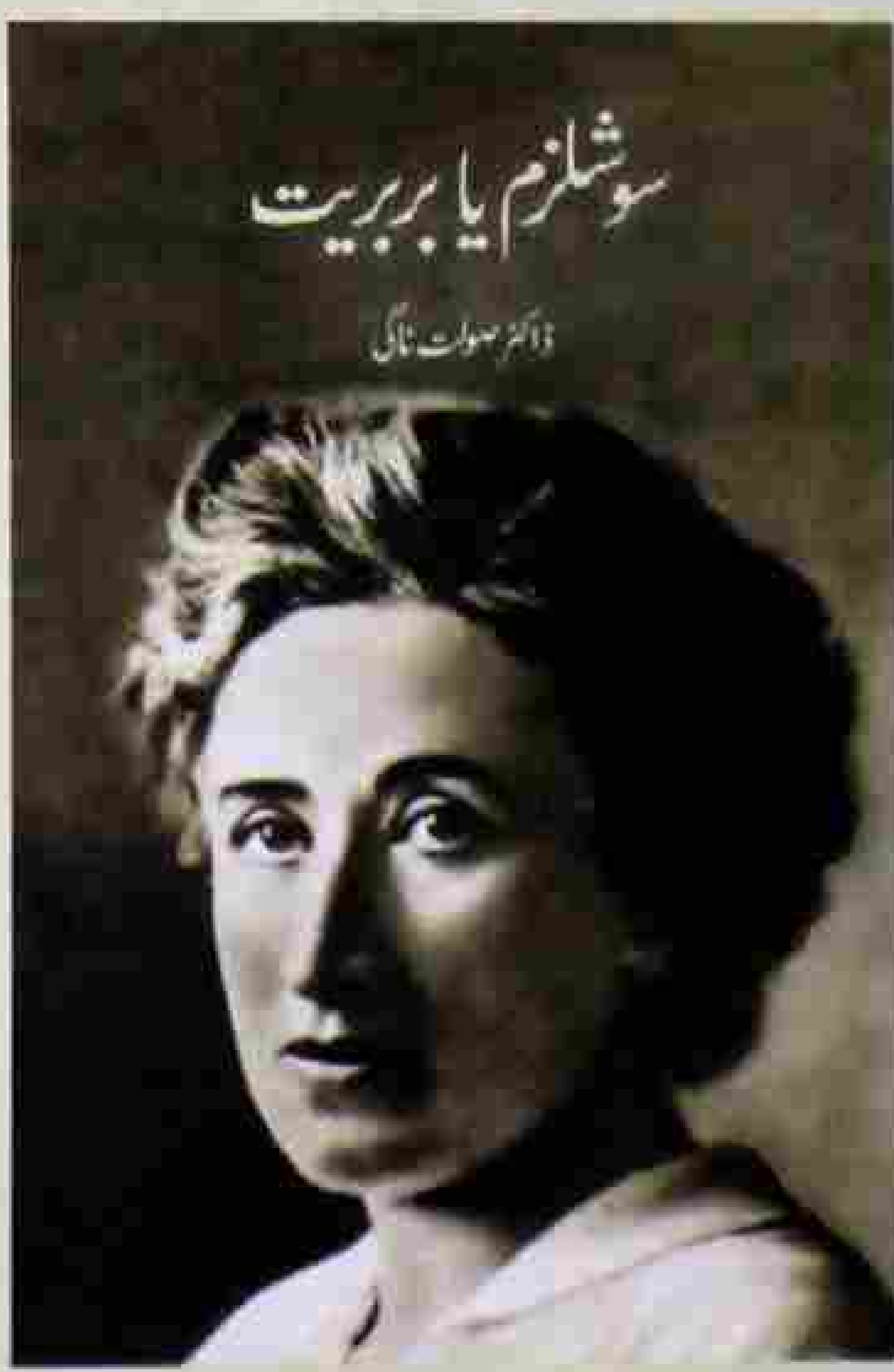

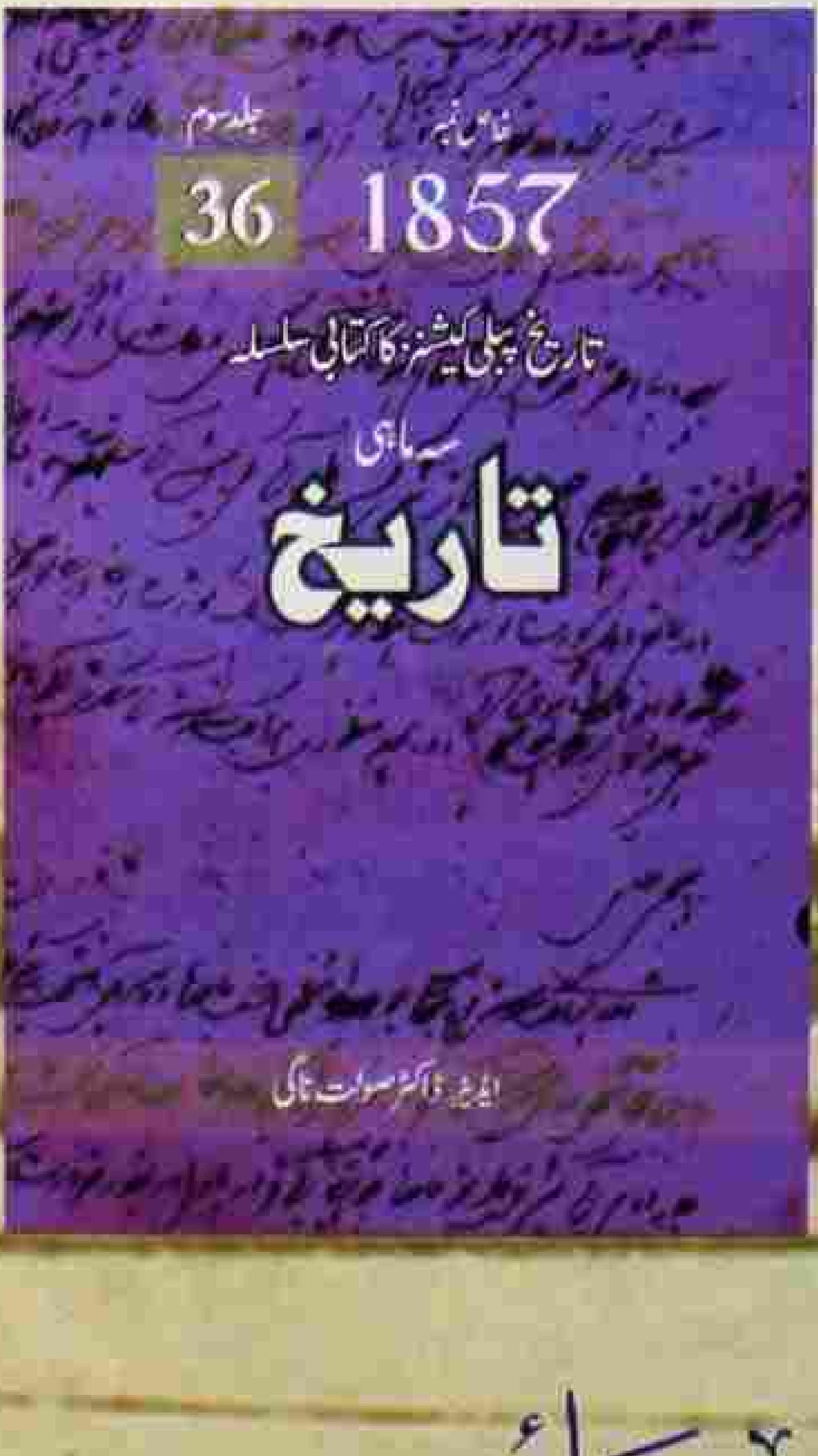

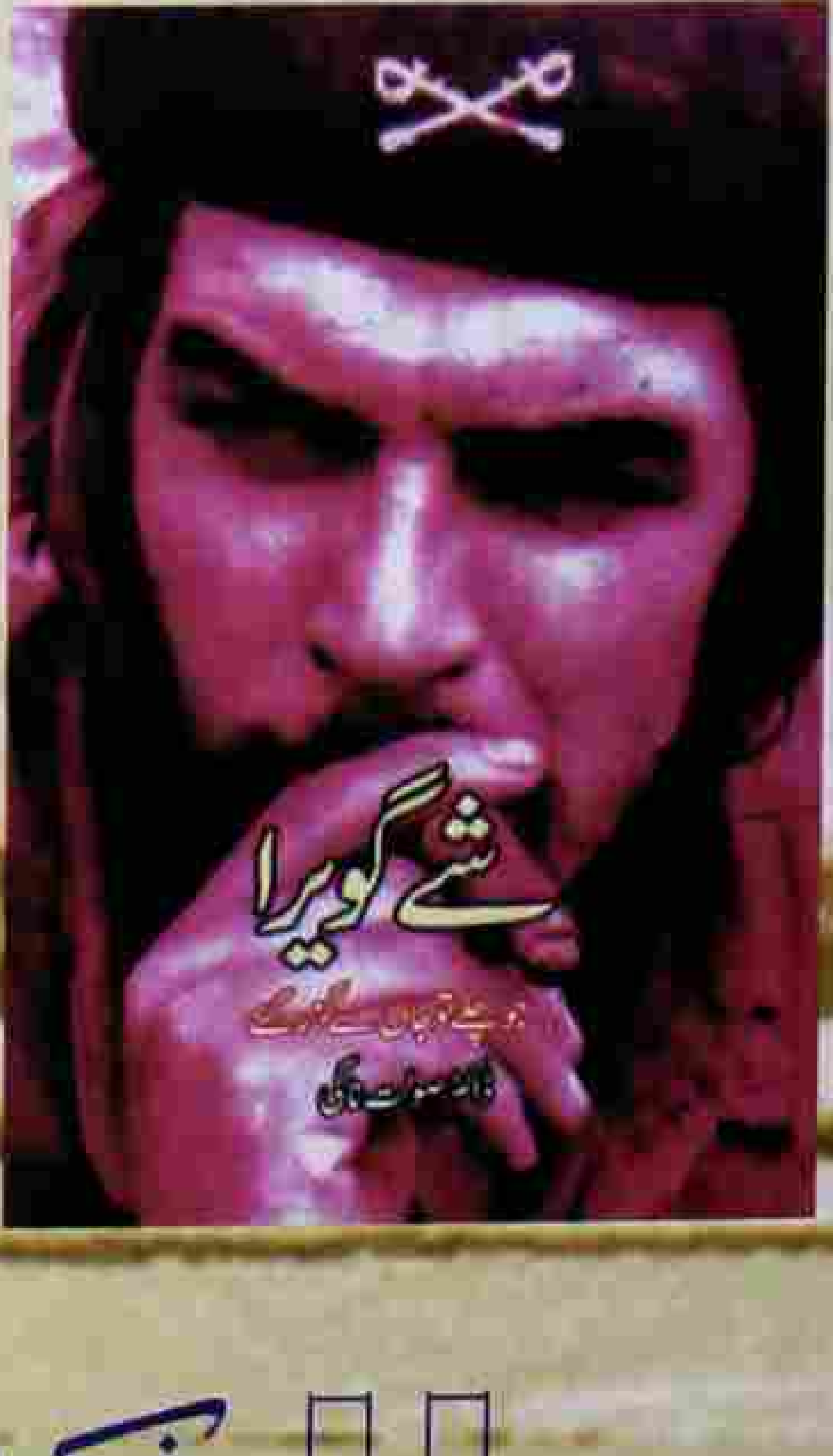

فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ لاہور
E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph: 042-7249218, 7237430

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں